فروری 2005

ماہ نامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

سونامی کا قہر

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مشترکہ تعاون سے مولانا عبدالماجد دریابادی کی حیات وخدمات پر راجندر بھون، دین دیال اپادھیائے مارگ، نئی دہلی میں 15رجنوری 2004 کو ایک سیمنار کا انعقاد کیا گیا۔ سیمنار کے افتتاحی اجلاس میں شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر مولانا عطاء الرحمان قاسمی کی کتاب "امام شاہ ولی اللہ اور ان کے افکار ونظریات" کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ اس موقعے پر لی گئی تصویر میں (دائیں سے) ڈاکٹر اخلاق الرحمان قدوائی (گورنر، ہریانہ)، مولانا سید رابع حسنی ندوی، صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ)، مولانا انظر شاہ کشمیری اور ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ (ڈائرکٹر قومی اردو کونسل)۔

12 دسمبر 2004 کو جمال محمد کالج ترچیراپلی، تمل ناڈو میں قومی اردو کونسل کی طرف سے چلائے جارہے کمپیوٹر ایپلیکیشن اینڈ ملٹی لنگول ڈی۔ٹی۔پی۔ کورس کے کامیاب طلبہ وطالبات کے لیے جلسۂ تقسیم اسناد منعقد کیا گیا۔ اس موقعے پر جناب پی۔سی۔ پونین (وزیر فائنس، تمل ناڈو) اس کورس میں اوّل مقام حاصل کرنے والے طالب علم سید مظفر احمد کو سرٹیفکیٹ دیتے ہوئے۔ ساتھ میں بھارتی داس یونیورسٹی کی رجسٹرار ڈاکٹر راد ھا جلین کو بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

ماہنامہ

اردو دُنیا نئی دہلی

جلد۔7، شمارہ۔2 فروری 2005

مدیر: ڈاکٹر محمد حمیداللہ بھٹ

معاون مدیر: فیروز عالم

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان
...نی وسائل، محکمۂ ثانوی و اعلا تعلیم، حکومتِ ہند

کمپوزنگ: قومی اُردو کونسل

مطبع: جے کے آفسیٹ پرنٹرس، جامع مسجد، دہلی 6

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اُردو کونسل

قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

چیک یا ڈرافٹ NCPUL کے نام روانہ کریں۔

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک۔1، ونگ۔6
آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی - 066 110
فون: 26103381, 26103938
فیکس: 26179657 26108159
ویب سائٹ:
http://www.urducouncil.nic.in
email: urducoun@ndf.vsnl.net.in

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک۔8، ونگ۔7،
آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109746

شاخ: 22-7-110 قمر دفتر، ساجدیار جنگ کمپلکس،
بلاک نمبر 5-1، چھتہ بازار، حیدرآباد-500002
فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

آپ کی بات .... خطوط 2

ہماری بات .... اداریہ 5

● اردو صحافت اکیسویں صدی کے اوائل میں (گیسٹ کالم) .... جی. ڈی. چندن 6

● مغربی بنگال میں اردو صحافت — آزادی کے بعد .... نوشاد مومن 10

● کثیر ثقافتی عالمی شہری سیاسی نظام میں لسانی رنگارنگی اور
ہندستان میں اردو کی صورتِ حال .... جگدیش ایس. گنڈارا 14

● اردو اور ہندستانی فلمیں .... سید سلیمان اختر 19

● جیکس دریدا .... وبجو زادنے 24

● افکارِ دریدا .... مدن لال کپور 27

● ڈیڑھ صدی کی ڈاک .... راجندر راجن 29

● موبائل فون کے مفید و مضر اثرات .... پریا تھیان 32

● ان پیج اردو — اردو کے لیے ایک مکمل سافٹ ویئر .... محمد عبدالباسط 34

اتہاس کے جھروکے سے:

● سکندرِ اعظم کا حملہ .... مدن گوپال 37

گوشۂ ادب:

● سنیما کا عاشق .... پطرس بخاری 42

● پانچواں کل ہند اردو کتاب میلہ (رپورتاژ) .... سلیمان اطہر جاوید 44

● علی احمد فاطمی سے گفتگو .... ممتاز انور 46

گوشۂ فروغِ کتب

● ہندستانی فنِ تعمیر مسلمانوں کی آمد سے قبل ("آثار الصنادید" سے اقتباس) . سید احمد خاں 48

● مولانا آزاد اور ملک میں سائنس کی ترقی
("مولانا آزاد کی سائنسی بصیرت" سے اقتباس) .... وہاب قیصر 51

طلبہ کے لیے

● تعلیم اور روزگار کے لیے 2005 میں مسابقتی امتحانات .... سلمان عابد 56

● بنیادی بیج بنانا .... شفقت علی 58

● تنقید و تحقیق (کوئز) .... محمد معین الدین 61

● بڑھتے قدم (کمپیوٹر سینٹر کے فارغ طلبہ کے انٹرویو-19) .... جاوید اقبال 64

اُردو خبرنامہ .... ادارہ 65

تبصرہ و تعارف .... کتابوں پر تبصرے 73

● دربارِ اکبری/ مولانا محمد حسین آزاد .... مبصر: اظہار احمد ندیم

● تعلیمی تشکیلِ نو کے مسائل/ خواجہ غلام السیدین .... مبصر: سراج نقوی

● جدید سیاسی فکر/ ڈاکٹر سید انوار الحق حقی .... مبصر: سراج نقوی

● ایک ٹکڑا دھوپ کا (شاعری)/ رمیندر جاکھو ساحل .... مبصر: مخمور سعیدی

● بیمار دل/ ترنم ریاض .... مبصر: محمد رحمت اللہ اشرف

بچوں کا گوشہ

● جڑواں شکل ("22 مختصر کہانیاں" سے ایک کہانی) .... اگیلا گری راج کمار 78

آپ کی بات

■ ساجدہ زیدی، ہگیرگ، سرودھید، علی گڑھ (یوپی)

آپ کی مؤثر رہنمائی میں اردو کے فروغ کے لیے مختلف سطحوں پر کونسل نے جو قابلِ تعریف کام کیے ہیں ان کی میں قدر کرتی ہوں اور اس کے لیے آپ کو مبارک باد پیش کرتی ہوں۔

میں آپ کی توجہ کونسل کے کاموں کی چند کمزوریوں اور تعلیمی نقطۂ نظر سے قابلِ غور امور پر دلانا چاہتی ہوں۔ کونسل تنقید اور نام نہاد تحقیق کے لیے مالی تعاون فراہم کرا کے اس نوع کی کتابوں کی اشاعت کے ذریعے ان کے فروغ کو بڑھاوا دے رہی ہے؛ جبکہ تمام تخلیقی کاموں کو اس کے تعاون سے محروم رکھا گیا ہے۔ کیا تنقید کی بنیاد شاعری اور ادب پر قائم نہیں ہے؟ یہ دلیل دی جا سکتی ہے کہ قومی اردو کونسل کا تعلق صرف اردو زبان کی ترقی سے ہے، لیکن کیا زبان بغیر "مواد" کے زندہ رہ سکتی ہے؟ ادب انسانی، تعلیمی اور سماجی نقطۂ نظر سے بہترین مواد فراہم کراتا ہے۔

آپ میرے اس خیال سے متفق ہوں گے کہ شاعری، فکشن، ڈراما، سوانح نگاری اور ممتاز اہلِ قلم کی کلیات وغیرہ کے لیے ہر طرح کی مالی معاونت مہیا کرائی جانی چاہیے۔ یہ وہ افراد ہیں جو تمام مشکلات کے باوجود اردو کی خدمت کر رہے ہیں۔ اگر ضرورت پڑے تو اصول و ضوابط کو بدل کر یا ان پر نظرِ ثانی کر کے اردو کی ترویج کے لیے اہم شاعروں، ادیبوں اور دیگر حضرات کو اس میں شامل کیا جائے۔

یہ کونسل کے لیے اعزاز کی بات ہوگی کہ ممتاز اور سینئر ادیبوں اور شاعروں کی کلیات، سوانح اور خودنوشت شائع کی جائیں۔ یہ کتابیں ہماری آئندہ نسلوں کے لیے اہم ماخذ بننے کے ساتھ ساتھ اردو زبان و ادب میں اسکالرشپ کے فروغ میں اہم خدمات ادا کریں گی۔

ہم نے آپ کے خط کا مرکزی خیال خصوصاً "کیا زبان بغیر مواد کے زندہ رہ سکتی ہے؟" نوٹ کر لیا ہے۔ آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ کونسل پریم چند جیسے بڑے ادیب کی کلیات چھاپ چکی ہے اور کلیاتِ منٹو جلد ہی شائع ہونے والی ہے۔ اس کے علاوہ کونسل نے کلیاتِ قلی قطب شاہ، کلیاتِ سراج، کلیاتِ میر، کلیاتِ سودا، کلیاتِ مصحفی، کلیاتِ ذوق، کلیاتِ اکبر الٰہ آبادی اور کلیاتِ آغا حشر کاشمیری بھی شائع کی ہیں۔ ہم نے اپنے اشاعتی پروگرام میں ممتاز اور اہم قلم کاروں کی سوانحیں بھی شامل کی ہیں۔ (ادارہ)

■ شاہنواز احمد صدیقی، کاشی پور، رام پور (یوپی)

''اردو دنیا'' کا ہر شمارہ اپنی آب و تاب اور کارآمد مضامین کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے۔ میں پچھلے چار ماہ سے "اردو دنیا" پڑھ رہا ہوں۔ اس کے مطالعے نے میرے اندر ایک نیا جوش اور روشنی پیدا کر دی ہے۔ "اردو دنیا" سے میری دلچسپی کی وجہ یہ بھی ہے کہ اس کے مضامین نہ صرف معلومات فراہم کرتے ہیں بلکہ ہمارے اندر ادبی صلاحیتیں بھی پیدا کرتے ہیں۔ محمد رفیع انصاری کا مضمون "جواہر لال نہرو کی اردو دوستی" اور قرۃ العین حیدر کا مضمون "ملک راج آنند" بہت پسند آیا اور یہ پتہ چلا کہ انگریزی کا مشہور ناول نگار بھی اردو کا عاشق تھا۔ اقبالیات کوئز کے سوالات و جوابات بہت مفید ہیں۔ آپ سے گزارش ہے کہ اس سلسلے کو جاری رکھیں۔

■ ایس اخلاق حسین اثر، صادق منزل، چوکی امام باڑہ، بھوپال

مصروفیت بہت زیادہ ہے پھر بھی ''اردو دنیا'' ہر ماہ ضرور خریدتا ہوں، کچھ پڑھ لیتا ہوں، کچھ نہیں۔ یہ اطمینان تو رہتا ہے کہ ذاتی لائبریری میں ''اردو دنیا'' محفوظ ہے۔

انگریزی اخباروں سے مضامین اور انٹرویو کے ترجموں کی اشاعت کا سلسلہ بہت خوب ہے۔ جسٹس جاوید اقبال کا اقبال پر مضمون بہت مفید تھا۔ ان سے قبل سلمان خورشید اور وسنت ساٹھے کے مضامین بھی ''ٹائمز آف انڈیا'' میں شائع ہوئے تھے۔ تازہ شمارے میں انتظار حسین کا انٹرویو اور پروفیسر قمر رئیس کا مضمون ''پریم چند، پاکستانی درس گاہوں کے نصاب میں'' بہت خوب ہیں۔ موخر الذکر مضمون میں ایک پیراگراف میں ہندستانی درس گاہوں کے نصاب میں پاکستانی فنکاروں کی تحریروں کی شمولیت کا ذکر کر دیتے تو ایک تقابلی خاکہ نظروں کے سامنے آ جاتا۔ مخمور سعیدی صاحب کا دہلی میں اردو صحافت سے متعلق مضمون مختصر اور مکمل تحریر کا بہترین نمونہ ہے۔

■ شاغل ادیب، 1-4-304/9/3، مذہب منزل، مشیر آباد، حیدرآباد

''اردو دنیا'' ہر ماہ پابندی سے مل رہا ہے۔ نومبر کے شمارے میں سرورق پر شہرہ آفاق ہندستانی قلم کار ملک راج آنند کی تصویر دیکھ کر جہاں طبیعت خوش ہوئی، اندرونی صفحات میں ''ہماری بات'' اور ''گوشۂ ادب'' میں ان کی موت اور ان سے متعلق سیر حاصل معلومات پڑھ کر آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

زیرِ نظر شمارے میں دونوں انٹرویوز ہندستان کے پہلے الیکٹرانک اخبار ''ای۔ سیاست'' کے چیف ایڈیٹرز احمد علی خاں اور پروفیسر محمد حسن سے گفتگو خوب ہیں۔ ''جواہر لال نہرو کی اردو دوستی'' اور ''مولانا ابوالکلام آزاد، ایک دور افتادہ صدا'' بھی نہرو جی اور مولانا آزاد کو بھرپور خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ دیگر مضامین بھی آپ کے حسنِ انتخاب اور کمالِ ادارت کے غماز ہیں۔ آخر میں بچوں

کے گوشے میں" دادا کی گم شدگی" بھی بڑا لطف دے گئی۔

آپ اپنی ادارت میں" اردو دنیا" کو ہر ماہ خوب سے خوب تر بنا رہے ہیں۔

■ **خان احمد فاروق، لکچرر شعبۂ اردو، علیم مسلم پوسٹ گریجویٹ کالج، کانپور**

اکتوبر کے" اردو دنیا" میں پروفیسر قمر رئیس کا مضمون" پریم چند پاکستانی درگاہوں کے نصاب میں" کے مطالعے سے میری معلومات میں کافی اضافہ ہوا۔ استادِ گرامی نے خیر سگالی کے جذبے کے زیر اثر مضمون میں محتاط انداز میں خوشی کا اظہار کیا ہے کہ پاکستانی درس گاہوں میں بشمول پریم چند ہندستانی ادبا و شعرا بھی شامل نصاب ہیں جن میں رتن ناتھ سرشار، سجاد حیدر یلدرم، راجندر سنگھ بیدی، کنھیا لال کپور، فراق گورکھپوری، کرشن چندر، قرۃ العین حیدر، اسرار الحق مجاز، رشید احمد صدیقی، صفیہ اختر، واجدہ تبسم، امانت لکھنوی، سعادت حسن منٹو، غلام عباس وغیرہ شامل ہیں۔

سوال یہ ہے کہ مجاز، صفیہ اختر اور واجدہ تبسم کے علاوہ ان میں ایسا کون سا ادیب اور شاعر ہے جس کے بغیر اردو کی تاریخ مکمل ہو سکتی ہے۔

کیا اردو فکشن کی تاریخ پریم چند، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، قرۃ العین حیدر، غلام عباس کے بغیر مکمل ہو سکتی ہے۔ کیا کلاسیکی نثر میں سے رتن ناتھ سرشار کو ہٹایا جا سکتا ہے؟ کیا ادبِ لطیف اور طنز و مزاح کی تاریخ کی مختصر ترین فہرست بھی رشید احمد صدیقی اور کنھیا لال کپور کے بغیر پوری ہو سکتی ہے؟ کیا اردو ڈرامے کی تاریخ امانت کی اندر سبھا کے بغیر بھی پڑھی، پڑھائی جا سکتی ہے؟

امیر خسرو سے لے کر داغ تک کون پاکستانی تھا؟ پاکستانی درس گاہوں میں ان کو نہیں پڑھایا جائے گا تو کس کو پڑھایا جائے گا؟ اگر پاکستانی ترتیبِ نصاب کے وقت کسی طرح کی قومی عصبیت یا تنگ نظری کو روا رکھتے تو اپنی اردو پڑھنے والی نسل کو کون سی تاریخ پڑھاتے، کیا یہ نسل ان لوگوں سے کبھی مواخذہ نہ کرتی؟

دونوں ملکوں کا اردو ادب اور اس کی تاریخ کو ایک اکائی سمجھنے کا متوازن موقف، صحت مند اور علم دوستانہ رویہ ہم ہندستانیوں کا ہمیشہ سے رہا ہے۔ اس کی ایک چھوٹی سی مثال یہ ہے کہ دہلی یونیورسٹی میں" پاکستانی ادب" کے نام سے ایک اختیاری پرچہ شامل کیا گیا۔ (غالباً یہ پرچہ 1995 کے آس پاس نصاب میں شامل کیا گیا۔) ہندستان کی ان بیشتر یونیورسٹیوں میں جہاں اردو تعلیم کا انتظام ہے کم و بیش پاکستانی ادیب و شاعر بلا کسی ملکی تفریق کے پڑھے پڑھائے جاتے ہیں۔

■ **رضوان خاں، شیخ سرائے، سیتاپور**

" اردو دنیا" شمارہ نومبر 2004 نظر نواز ہوا۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی پرچہ دلکش و اثر انگیز ہے۔ بعض مضامین خاص طور پر قابلِ تعریف ہیں مثلاً سید شہاب الدین صاحب کا مضمون" ایک بے گھر زبان کو زندہ رکھنے کی حکمتِ عملی"، " فنِ تعمیر کی یادگاریں" (جناب اے بی ایم حبیب اللہ) وغیرہ۔ اس کے علاوہ اردو خبر نامہ بھی پسند آیا۔ ہمارے شہر سیتاپور میں" اردو دنیا" بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھا بھی جاتا ہے۔" اردو دنیا" کو اہل اردو میں جو قدر و منزلت حاصل ہے وہ دوسرے رسائل کو شاذ و نادر ہی نصیب ہوئی ہے۔ آپ کی مدیرانہ صلاحیت اور آپ کی پوری ٹیم کی محنت کا اس کی کامیابی میں اہم رول ہے۔ برائے مہربانی اردو قواعد پر ایک مضمون ہر دوسرے تیسرے شمارے میں شامل کریں تاکہ طلبہ کو اردو زبان کی جانکاری قواعد کے ساتھ ہوتی رہے۔ بہت سی بنیادی چیزیں ایسی ہیں جو اچھے خاصے اردو جاننے والے بھی بعض اوقات miss کر جاتے ہیں۔ ایسے مضامین کی اشاعت سے ان کا revision ہو جائے گا۔

■ **تکمیل شاغل، سکریٹری انجمن ترقی اردو، کوآوان، وارڈ نمبر-9، بارا چکیا، مشرقی چمپارن، بہار**

اکتوبر 2004 کا شمارہ میرے سامنے ہے اور میں عزت مآب جناب ارجن سنگھ، مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل، حکومتِ ہند کے ان جملوں پر غور کر رہا ہوں" یہ افسوس ناک ہے کہ عربی اور فارسی جیسی عظیم زبانیں جنھوں نے ہندستان میں مشترکہ کلچر کی تشکیل میں ایک اہم رول ادا کیا، اپنا مقام کھوتی جا رہی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کی افادیت اور اہمیت کا احساس عام کیا جائے تاکہ ان زبانوں کے تئیں ہم لوگ اپنی ذمے داریاں ادا کر سکیں۔" جناب ارجن سنگھ نے جن باتوں کو محسوس کیا ہے، ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے وہ کر دکھایا ہے۔ کونسل نے ملک کی مختلف ریاستوں میں 124 عربی اسٹڈی سینٹر کھول کر مدرسوں کے طلبہ و طالبات کے لیے روزگار کے نئے مواقع فراہم کیے ہیں، جو قابلِ ستائش ہیں۔

اردو، فارسی اور عربی زبانیں پڑھنے والے طلبہ و طالبات احساسِ کمتری کا شکار تھے کہ ان زبانوں کی ڈگریوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ لیکن ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے اپنی دور اندیشی اور تدبر سے منفی پہلو کو مثبت پہلو میں تبدیل کر دیا ہے۔ اور اب ان زبانوں کو سیکھنے کا ذوق تیزی سے بڑھ رہا ہے کیونکہ اب یہ زبانیں بے روزگاری کی علامت نہیں رہیں بلکہ ان زبانوں نے روزگار کے نئے مواقع فراہم کیے ہیں اور اس کے لیے ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ خصوصی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

اس شمارے کا گیسٹ کالم" ہمارا مستقبل نینو ٹیکنالوجی میں ہے" (صدر جمہوریہ اے. پی. جے. عبدالکلام) کافی معلوماتی ہے۔ دیگر مشمولات، " سرحدوں کے پار"، " ایک شام جاوید اختر کے نام"، " پریم چند پاکستانی درسگاہوں میں" اور" رفعت سروش سے گفتگو" کافی اچھے ہیں۔

■ **فیروز احمد فیض، سکریٹری جمعیۃ المسلمین لائبریری، محسن پورہ، مئو ناتھ بھنجن**

اکتوبر کا شمارہ اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ نظر نواز ہوا۔ اس شمارے کے تمام مضامین بالخصوص" ہمارا مستقبل نینو ٹیکنالوجی میں ہے" اور" اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے" بہت پسند آئے۔ کنھیا لال کپور نے ہمارے ملک کے اندر پھیلی ہوئی برائیوں کا جس خوبصورتی کے ساتھ محاسبہ کیا ہے اور چاشنی سے لبریز جس کڑوی حقیقت کو انھوں نے قارئین کے سامنے پیش کیا ہے اس کی جتنی بھی

تعریف کی جائے کم ہے۔ اردو زبان کی ترویج و ترقی سے آگاہ کرنے اور اردو کو ترقی کی راہ کی پر لے جانے کے لیے آپ کو دلی مبارک باد۔ اس شمارے کے تمام قلم کاروں کو مبارکباد کہ ان کی کاوشوں کے نتیجے میں ہمیں مختلف علوم وفنون کے بارے میں مفید معلومات حاصل ہوئیں۔ خدا کرے اردو زبان آپ کی محنت و ہمت سے اسی طرح ترقی کی راہ پر گامزن رہے۔

■ **محمد ہاشم قدوائی، C-501، روز ووڈ اپارٹمنٹ، میور وہار، نئی دہلی**

نومبر 2004 کے شمارے میں "جواہر لال نہرو کی اردو دوستی" کے عنوان سے محمد رفیع انصاری کا مضمون، پروفیسر نثار احمد فاروقی کا بصیرت افروز مضمون "مولانا ابوالکلام آزاد۔ ایک دور افتادہ صدا"، سید شہاب الدین کا معلوماتی مضمون "ایک بے گھر زبان کو زندہ رکھنے کی حکمت عملی" اور مشہور و معروف انگریزی ادیب ملک راج آنند پر قرۃ العین حیدر اور رام پرکاش کپور کے مضامین بہت زیادہ پسند آئے۔ اقبالیات پر کوئز بھی بہت پسند آئی۔

■ **محمد فیاض بستی پوری، دارالعلوم دیوبند**

نومبر 2004 کا "اردو دنیا" میرے ہاتھ میں ہے۔ اس کے تمام مضامین معلوماتی ہیں، خصوصاً "ایک بے گھر زبان کو زندہ رکھنے کی حکمت عملی" سے اردو کا سفر، اس کا انحطاط اور اس کے ارتقا کے بارے میں اچھا خاصا علم ہوا۔ "چین انقلاب کے بعد کی دنیا" کافی دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ "کوئز اقبالیات" بہت ہی مفید ہے اور اس سے بہت خوشی بھی ہوئی کہ بیٹھے بیٹھے پچاسوں سوالات حل ہوگئے۔ بچوں کا گوشہ "دادا کی گم شدگی" بے حد پسند آیا۔

■ **محمد ظفر الدین، مگی ہاؤلی، حیدرآباد (اے پی)**

حیدرآباد میں کتاب میلے کے کامیاب انعقاد پر مبارکباد قبول کیجیے۔ الکٹرانک میڈیا اور خاص طور پر کمپیوٹر اور اس سے متعلق سہولتوں مثلاً ویب سائٹ، کتابوں کی سی ڈیز، ای ڈکشنریز وغیرہ کی وجہ سے پڑھنے کے رجحان میں کافی کمی ہوتی جارہی ہے۔ اس صورتِ حال میں کونسل کی جانب سے مختلف شہروں میں کتاب میلے کا اہتمام انتہائی مستحسن قدم ہے۔ اس طرح کے میلوں کے ذریعے نہ صرف کتابوں کی تشہیر اور فروخت کی صورت نکلتی ہے بلکہ ان میں لوگوں کی دلچسپی بھی پیدا ہوتی ہے۔ میلے کے دوران مختلف علمی و ادبی تقریبات اور مقابلوں سے میلے میں مزید جان پڑ گئی تھی۔ کونسل کے عملے نے میلے کی پلاننگ اور پبلسٹی بھی بڑے منظم انداز سے کی۔ حیدرآباد کے لوگوں میں کتاب میلے سے متعلق اچھے تاثرات ہیں۔

■ **کے اے زرتار گر، باگلکوٹ، (کے ایس)**

"اردو دنیا" کے تازہ شمارے میں رام پرکاش کپور کے مضامین و خطوط نہایت فکر انگیز ہیں۔ عربی زبان و ادب پر شفیق احمد خاں ندوی کا تحقیقی مضمون پسند آیا۔ اردو زبان و تعلیم پر دیگر مضامین بھی فکر انگیز ہیں۔ اظہار اثر کا مضمون بے حد معلوماتی ہے۔ حکیم اشہر قدیر نے بھی علاج بالحرارت سے "اردو دنیا" میں حرارت پیدا کی ہے۔ خواجہ حسن نظامی کے مضمون سے بیشتر اردو داں واقف ہیں پھر بھی "اردو دنیا" میں اس کی اشاعت قابلِ قدر ہے۔ کیریئر گائیڈنس سے طلبہ برسرِ روزگار ہو رہے ہیں، یہ اردو دنیا کا قوم پر بڑا احسان ہے۔ دیگر مشمولات بھی معیاری ہیں۔

■ **اختر یوسف ہمری اردو ہندو نگر، ڈورنڈہ، رانچی**

"اردو دنیا" برابر مل رہا ہے۔ یقیناً یہ ایک اہم معلوماتی رسالہ بن گیا ہے۔ سرورق کے رنگوں اور اس کے اندر کے اجلے پن نے اسے بہت منفرد بنا دیا ہے۔ مختلف ادبی، سماجی اور تکنیکی مسائل پر معیاری مضامین رسالے کی خصوصیت ہیں۔ ادھر اردو کے سلسلے میں کئی مضامین اور خطوط دیکھے، جو اردو سے بے پناہ محبت کی علامتیں ہیں۔ مگر دقت یہ ہے کہ اردو کے معاملے میں اچھے خاصے لوگوں کی سوچ بہت منفی ہے۔ "اردو نے ہی ملک کو تقسیم کرایا" راگ تو بہت پرانا ہے لیکن اس کی گونج ادھر کے چند برسوں میں بہت بڑھی ہے۔ اب اس کا کیا کیا جائے۔ ہمارے ملک کی یہ بدقسمتی ہے کہ یہاں کچھ لوگ ہمیشہ سے عوام کا جذباتی استحصال کرتے آئے ہیں۔ جانے یہ سیلاب بلا کہاں جا کر رکے گا۔

■ **شاہد انور، سکریٹری انجمن فروغ اردو، رانچی، جھارکھنڈ**

میرے ہاتھوں میں "اردو دنیا" ستمبر کا شمارہ ہے جس میں تمام مشمولات قابلِ مطالعہ اور اہم ہیں۔ "انٹرنیٹ کے ذریعے عالمی کیریئر" طلبہ کے لیے بہت ہی اہمیت کا حامل ہے۔ "آپ کی بات" میں جناب شکیل شاغل، جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو چکیا، مشرقی چمپارن، بہار کی گزارشات عزت مآب ارجن سنگھ کے نام شائع ہوئی ہیں جو تمام مشمولات میں اہم ہیں کیونکہ ان گزارشات اور مطالبات سے اردو کا مستقبل منسلک ہے اور جناب ارجن سنگھ کو ان پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ متحدہ ترقی پسند محاذ حکومت کا رویہ ملک کی سب سے بڑی اقلیت کے ساتھ ہمدردانہ ہے اور اس طبقے کے لوگ بھی تمام گلے شکوے بھول کر عزت مآب ارجن سنگھ کی آواز پر لبیک کہہ رہے ہیں اور اس کا فائدہ آئندہ انتخابات میں کانگریس کو ہوگا۔

■ **عابد صدیقی، نیوز ایڈیٹر، دوردرشن، حیدرآباد**

حیدرآباد میں چھٹے کل ہند اردو کتاب میلے کے کامیاب انعقاد پر مبارکباد قبول کریں۔ یہ میلہ ریاست خصوصاً حیدرآباد کی اردو داں آبادی کے لیے بے حد مفید اور کارآمد تھا۔ آپ کی قیادت میں کونسل ترقی کی راہ پر گامزن ہے اور مسلسل فروغِ اردو کی کوششوں میں مصروف ہے۔

■ **سید محمد اسمٰعیل، وائس پرنسپل، گورنمنٹ مسلم ٹیچر ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ، 71، طاہر صاحب اسٹریٹ، ماؤنٹ روڈ، چنئی-2**

اردو زبان کے لیے آپ کی خدمات اور "اردو دنیا" کے بارے میں میڈیا اور مقتدر شخصیات سے میں نے کافی کچھ سنا اور پڑھا ہے۔ اردو مخالف پالیسیوں اور جھوٹے وعدوں کے اس دور میں صرف آپ کی بلند و بالا شخصیت ہے جو تمام رکاوٹوں کا سامنا کرتے ہوئے اردو داں عوام کی خدمت میں منہمک ہے۔

ہماری بات

حادثات و سانحات زندگی کا حصہ ہیں۔ انسان اپنی زندگی میں آنے والی مصیبتوں، پریشانیوں، صدموں اور تکلیفوں کو تو وقت کے ساتھ بھولتا چلا جاتا ہے لیکن جب سنبھلنے کا کوئی موقع دیے بغیر اچانک کوئی اجتماعی مصیبت نازل ہوتی ہے اور خوفناک تباہی کے گہرے زخموں سے انسانی زندگی کو لہولہان کر جاتی ہے تو یہ زخم بہت دنوں تک مندمل نہیں ہوتے۔ گذشتہ 26 دسمبر کو ساترا سے اٹھی خوفناک سونامی لہروں نے کچھ ہی لمحوں میں دور دور تک جو تباہی و بربادی پھیلائی اور ہزاروں لوگوں کی جان لے لی اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

26 دسمبر سے پہلے شاید ہی ہم میں سے کسی نے ''سونامی'' لفظ سنا ہوگا ایسا بھیانک سمندری طوفان جس نے ہندستان کے جنوبی ساحلی علاقوں سمیت جنوبی اور جنوبی مشرقی ایشیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور وہ تباہی پھیلائی جو اب تک کی سب سے بڑی خوفناک قدرتی آفات میں سے ایک ثابت ہوئی۔ امریکی سائنس دانوں کے مطابق اس کی وجہ سے زمین اپنے کور سے ڈگمگا گئی اور اس کی گردش کی رفتار تیز ہوگئی جس سے دن کے اوقات میں سے ہمیشہ کے لیے ایک سیکنڈ کا کچھ حصہ کم ہوگیا۔ ساترا، انڈونیشیا میں سطح سمندر میں آئے زلزلے سے اٹھی سمندری لہروں کی زد میں آکر، جنھیں جاپانی زبان میں سونامی کہتے ہیں اب تک ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ لوگ مارے گئے ہیں، لاکھوں لوگ بے گھر ہوگئے ہیں اور اربوں روپے کی املاک برباد ہوگئی ہیں۔ ان سونامی لہروں کی وجہ سے بجلی کے کھمبے اکھڑ جانے کے بعد کئی شہر اندھیرے میں ڈوب گئے، ٹیلی فون کے تار اور کھمبے تہس نہس ہوگئے اور رابطے کا کوئی ذریعہ باقی نہ رہا سڑکوں پر اور دکانوں کے آگے ہجوم در ہجوم وہ بے یار و مددگار لوگ نظر آتے ہیں جن کے گھر سونامی کی نذر ہوگئے ہیں۔ ایسے میں جیسے ہی کوئی گاڑی کھانے کی چیزیں اور پانی لے کر وہاں پہنچتی ہے، مرد، عورتیں اور بچے بھوکے جانوروں کی طرح اس پر لوٹ پڑتے ہیں۔

سونامی کے قہر کی زد میں آکر سری لنکا میں 30500، انڈونیشیا میں 94081، تھائی لینڈ میں 5200 اور ہندستان میں بڑی تعداد میں لوگ مارے گئے ہیں۔ انڈمان نکوبار جزائر میں 10000 لوگ لاپتہ ہیں یا مر گئے ہیں، کیرل میں 170 اور آندھرا پردیش میں 105 لوگ موت کی آغوش میں سو گئے، تمل ناڈو میں مچھواروں کی چھوٹی سی بستی ناگ پٹینم میں ہی تقریباً 6000 لوگ مارے گئے۔ پورے صوبے میں 7921 لوگ جاں بحق ہوئے ہیں اور 80000 سے زیادہ لوگ بے گھر ہوگئے ہیں۔ ان اعداد و شمار سے اس بھیانک تباہی کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے جس کی پرتیں لگاتار کھل رہی ہیں۔

کوچی کا باشندہ ورجد یوڈا اس سانحے کو یاد کرتے ہوئے بتاتا ہے۔ ''صبح کے نو بجے تھے۔ صبح کے دعائیہ جلسے میں شامل ہونے کے بعد سیکڑوں دیگر عقیدت مندوں کی طرح ہم نے بھی سمندر کے ساحل پر قائم دکانوں سے چھوٹی موٹی چیزیں خریدیں، پھر ہم پانی کی طرف بڑھے، اچانک ہی سمندر سے تیز آواز کے ساتھ ایک لہر ہماری طرف بڑھی۔ سیکڑوں بچے اور ہر عمر کے مرد اور عورت الٹے پاؤں چرچ کی طرف بھاگے۔ میں بمشکل چرچ کی سیڑھیوں تک پہنچ سکا مگر اس کے بعد سے میں نے اپنے خاندان کے کسی آدمی کو نہیں دیکھا۔ پانی کچھ ہی منٹوں میں واپس چلا گیا اور اس کے بعد دو چھوٹی لہریں اور آئیں۔ بمشکل 20 منٹوں کے اندر 15 سے 20 میٹر اونچی لہروں نے 300 جانیں لے لیں اور خاصی تباہی پھیلا دی۔''

اس آفتِ ناگہانی نے جہاں بہت سارے لوگوں کے ہوش اڑا دیے وہیں کچھ ایسے بہادر اور انسان بھی تھے جنھوں نے ڈرنے یا گھبرانے کے بجائے اس مصیبت کا بہادری سے مقابلہ کیا اور اپنے ساتھ دیگر کئی لوگوں کی جان بھی بچائی۔ نکوبار کے ایک مچھوارے کی بیٹی میگی گیٹس بھی انھی میں سے ایک ہے۔ 18 سالہ میگی کو جیسے ہی سونامی کا احساس ہوا اس نے اپنے والدین اور دیگر 41 لوگوں کو بیڑے پر بٹھایا اور سمندر میں اتر گئی۔ 10 میٹر سے زیادہ اونچی سونامی لہریں اس کے بلند ارادوں کے سامنے بونی ثابت ہوئیں اور دو دنوں کی مشقت کے بعد وہ سبھی لوگوں کو بخیریت موت کے منہ سے بچا لائی۔

ایسی ناگہانی آفات ماضی میں بھی آتی رہی ہیں۔ قدرت کے اس قہر کو روک پانا تو ممکن نہیں ہے لیکن انتباہی نظام کے ذریعے جان و مال کے نقصان کو ضرور کم کیا جاسکتا ہے۔ ہندستان اور سمندر کے کنارے بسے دوسرے ملک اگر سمندر کے ساحلی علاقوں کے لوگوں کو دو ایک گھنٹے پہلے خبردار کرنے والے بین الاقوامی سونامی انتباہی سسٹم کے ممبر ہوتے تو شاید جان و مال کا اتنا نقصان نہیں ہوتا۔ اس سسٹم کے تحت بحرالکاہل کے ساحلوں پر آباد ملکوں سمیت کل 26 ملکوں میں سونامی لہروں کے بارے میں پیشگی اطلاع مل جاتی ہے۔ اس کا امریکا اور جاپان خاص طور سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ بحرِ ہند کے ساحلی علاقوں سے تعلق رکھنے والا کوئی بھی ملک اگر اس کا ممبر ہوتا تو اسے پہلے ہی اس کی خبر مل جاتی اور ہندستان میں تو محفوظ مقام پر جانے کے لیے لوگوں کو دو تین گھنٹے مل جاتے۔

بہر طور اس سانحے سے ہم نے بہت کچھ سیکھا ہے اور جس طرح تمام لوگوں نے مل جل کر مصیبت کی اس گھڑی میں متاثرہ لوگوں کی مدد کی ہے اور کر رہے ہیں وہ اپنے آپ میں انسانیت اور بھائی چارے کی ایک بہترین مثال ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ آئندہ سونامی جیسے خطرات کا مقابلہ کرنے اور لوگوں کے جان و مال کے تحفظ کے لیے بہتر حکمتِ عملی اختیار کی جائے۔

گیسٹ کالم

جی. ڈی. چندن

اردو صحافت — 21 ویں صدی کے اوائل میں

اکیسویں صدی کے اوائل میں ملک میں اردو صحافت کا منظر نامہ گذشتہ زمانوں سے بہت مختلف ہوگیا ہے۔ مسطر اور کاتب کا رواج ختم ہو رہا ہے۔ نئے کاتب کمپیوٹر کے کلیدی بورڈ پر انگلیاں تھما رہے ہیں۔ لیتھوگرافی رخصت ہوچکی ہے۔ روٹری اور فوٹو آفسیٹ کی نئی مشینوں سے تصویروں کی اشاعت کا رواج نکھر رہا ہے۔ خبروں کے شعبے میں نہ صرف بہت سارے اخبارات اپنے رپورٹروں سے کام لے رہے ہیں بلکہ الیکٹرانک کمپیوٹر کے نظام پر کام کرنے والی ایک اردو نیوز ایجنسی کی خدمات کا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ خبروں کی دوڑ میں اخبارات ٹیلی ویژن پر دن بدن بڑھنے والے نیوز چینلوں کی رقابت کا سامنا کر رہے ہیں۔ مختصر سرمایہ سے اخبار شروع کرلینا ناممکن ہوگیا ہے۔ ایڈیٹروں کے موضوعات فرقہ وارانہ تنازعوں اور مذہبی تصورات سے متاثر نہیں ہوتے بلکہ اقتصادی مسائل، سماجی انصاف اور فروغ علم کی تدبیروں پر متوجہ ہونے سے بامعنی ہوتے ہیں۔

ماضی میں اردو پریس ملک کے شمالی حصے ہی کا ایک امتیاز تھا اور جنوبی ہند کے اردو پریس کا مرتبہ یا تو تسلیم ہی نہیں ہوتا تھا یا اسے تصویر کا دوسرا رخ تصور کیا جاتا تھا۔ اس فاصلے کا پس منظر بھی تھا۔ ملک کی صحافت کے بارے میں پورے سال کی اوّلین سرکاری رپورٹ بابت 1957 کی رو سے اس سال یعنی حصولِ آزادی کے دس سال بعد جنوبی ہند کی تمام تین اردو نواز ریاستوں یعنی آندھرا پردیش، میسور (اب کرناٹک) اور مدراس (اب تامل ناڈو) میں اردو کے اخباروں کی کل تعداد 44 تھی اور ان کا مجموعی سرکولیشن 34037 تھا۔ یہ دونوں اعداد و شمار شمالی ہند کے دہلی، پنجاب یا اتر پردیش کی کسی ایک ریاست کے اعداد سے کم تھے۔ اب اس باب میں تبدیلی نہ صرف نمایاں ہے بلکہ تصویر کے دوسرے رخ کی روشنی آنکھوں کو خیرہ کر رہی ہے۔

ہندستان جیسے عظیم ملک میں جہاں آج 29 ریاستیں جیسے یونین علاقے، 19 بڑی ریاستیں (جو آئین کے لسانی شیڈول میں شامل ہیں)، ایک ارب سے اوپر کی آبادی اور مختلف زبانوں کے ہزار ہا اخبارات ہیں، کسی بھی زبان کی صحافت کے بارے میں کوئی بھی یا سرسری اندازہ تو کارگر بھی نہیں ہوسکتا۔ ماضی میں یہاں چند ہی زبانوں کے اخبارات تھے۔ برطانوی عہد کے بیورو آف پبلک انفارمیشن کی دوسری عالمی جنگ کے زمانے کی ایک خفیہ رپورٹ مطبوعہ 1942 سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت دہلی کے مرکزی سکریٹریٹ میں انگریزی کے ساتھ صرف اردو، ہندی، بنگالی، تمل اور گجراتی یعنی پانچ زبانوں کے لیے پبلسٹی مواد کی تقسیم کے شعبے تھے۔ آج مرکزی حکومت 19 زبانوں میں اپنا اطلاعاتی مواد تقسیم کر رہی ہے اور ان کے لیے معمولی شعبے نہیں بلکہ مرکزی اور ریاستی راجدھانیوں اور دیگر بڑے شہروں میں پورے پورے دفاتر قائم ہیں۔ نسبتاً قلیل تعداد کے باوجود ملک پر مسلط غیر ملکی حکومت نے اپنی عملداری کے اخباروں کے کوئی وسیع یا مفصل اعداد و شمار شائع نہ کیے۔

حصولِ آزادی کے بعد ہندستان کے پہلے پریس کمیشن کی سفارش پر یہاں 1956 میں پریس رجسٹرار کا ایک دفتر قائم ہوا جس کا کام ملک کے مختلف زبانوں کے اخباروں کے اعداد اور متعلقہ کوائف حاصل کرنا اور ہر سال ان پر ایک رپورٹ شائع کرنا ہے۔ اس دفتر نے 1956 ہی میں جو رپورٹ شائع کی وہ اس سال کے موخر چھ ماہ کی مدت کی تھی۔ اس کے بعد اس نے 1957 کے پورے سال کی رپورٹ شائع کی جس میں ملک بھر کے اردو اخباروں کی کل تعداد 513 بتائی گئی جو انگریزی کے 1188 اور ہندی کے 1127 کے بعد تیسرے نمبر پر تھی۔ اردو اخباروں کا مجموعی سرکولیشن 7,84,000 تھا۔ اس طرح اردو اخباروں کا سرکولیشن انگریزی کے 24,97,000، ہندی کے 20,25,000 اور تمل کے 10,21000 کے بعد چوتھے نمبر پر تھا۔

حصولِ آزادی کے بعد یہ پہلی سرکاری رپورٹ تھی جس میں باضابطہ تلاش و تحقیق کے بعد ملک بھر کی مختلف زبانوں کے اخباروں کے اعداد و شمار پیش کیے گئے۔ 1947 میں ملک کی تقسیم کی وجہ سے اردو صحافت کا ایک اہم رقبہ بالخصوص مغربی پنجاب کا گوشہ پاکستان کے علاقے میں شامل ہوگیا تھا۔ اس کٹر بیونت کے باوجود آزادی کے دس سال بعد اردو صحافت کا رتبہ ایسا حقیر نہیں تھا جیسا کہ کچھ قنوطیت پسند حلقوں نے 15 اگست 1947 کے فوراً بعد پیش کیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ملک کی تقسیم کی وجہ سے زمیندار، انقلاب، احسان اور شہباز ایسے گھن گرج اخبارات پاکستان کے دامن میں چلے گئے لیکن آزادی کی آمد کی طرح اس کے مضمرات بھی تاریخ کے حصے تھے جن سے برصغیر کی از سر نو تشکیل و ترتیب ہوئی۔

انھی مضمرات میں پرتاپ، ملاپ، ویر بھارت، ہند سماچار، ہم، پارس، تیج، بیسویں صدی اور چند دیگر روزناموں اور رسالوں کا منقسم ہندستان کی

دولت بن جانا بھی شامل تھا۔ یہ وہ اخبار تھے جنھوں نے 20ویں صدی میں برصغیر کی نئی سیاسی اور ثقافتی تاریخ کی تشکیل و ترتیب میں گہری دل چسپی لی۔ انھوں نے تحریکِ آزادی کی مجاہد" قوم پرست جماعت" انڈین نیشنل کانگریس کی مسلسل حمایت اور مدد کی اور دو قومی نظریے، جس کی بعض اردو اخبارات حمایت کررہے تھے، کے دوسرے رخ کو آشکار کیا اور اس طرح اردو صحافت میں توازن پیدا کیا۔ آج زمیندار، انقلاب، احسان اور شہباز تو سب اپنی سرزمین ہی میں سوکھ اور کمہلا گئے ہیں لیکن پرتاپ اور ملاپ نئی دھرتی میں اپنی پرانی شان اور آن سے لہرا رہے ہیں۔

ان اخباروں کے ایڈیٹروں اور صحافیوں میں بڑے بڑے دانش ور اور دوراندیش نثر نگار اور شعرا شامل رہے جن میں سے بعض تو خود مجاہدینِ آزادی تھے اور بعض نے کئی سیاسی جانبازوں کی خاموش اور اعلانیہ حمایت اور مدد کی۔ اردو زبان کی ساخت و پرداخت سے ہم آہنگ ان کے عملے اور قارئین میں سب فرقوں کے لوگ شامل رہے ہیں۔ یہ اخبارات وہاں بھی اور یہاں بھی اردو صحافت کے سرکولیشن میں قابلِ رشک اضافہ کرتے رہے ہیں اور ان میں بعض آزادی کے روزِ اوّل سے دہلی کی اردو صحافت کی آبرو ہیں۔

پریس رجسٹرار کی 1957 کی رپورٹ میں بتایا گیا کہ اس وقت دہلی میں اردو پریس، تعداد (132) اور سرکولیشن (4,23,000) دونوں کے لحاظ سے انگریزی کے بعد (تعداد :273، سرکولیشن :4,84,000) دوسرے نمبر پر تھا۔ ہندی صحافت تیسرے نمبر پر تھی۔ پنجاب میں یہ تعداد (130) اور سرکولیشن (67,708) دونوں کے لحاظ سے انگریزی سے (تعداد :54، سرکولیشن :50,705) اوپر تھا۔

لیکن پریس رجسٹرار کی 03-2002 کی تازہ ترین رپورٹ میں نقشہ بدل گیا ہے۔ اس رپورٹ میں اعداد و شمار تین مختلف طریقوں سے کیا گیا ہے۔ 2002 کی رپورٹ کے مطابق دہلی میں اردو صحافت تعداد اور سرکولیشن دونوں کے لحاظ سے ہندی اور انگریزی کے بعد تیسرے نمبر پر تھی۔ پنجاب میں تعداد کے لحاظ سے پنجابی، ہندی اور انگریزی کے بعد چوتھے نمبر پر اور سرکولیشن کے لحاظ سے پنجابی اور ہندی کے بعد تیسرے نمبر پر تھی۔ اس طرح جنوبی ہند کی تبدیلی بھی چشم کشا ہے۔ 2002 کی رپورٹ کے مطابق اکیلے آندھرا پردیش میں "رجسٹرڈ" اردو اخباروں کی تعداد 495 تھی جو ریاست کی سرکاری زبان تیلگو کے بعد دوسرے نمبر پر تھی۔ ان اردو اخباروں کا مجموعی سرکولیشن 3,27,116 تھا۔ پڑوسی ریاست کرناٹک میں اردو اخباروں کی تعداد 133 اور مجموعی سرکولیشن 1,75,537 تھا۔

ظاہر ہے کہ زیرِ نظر رپورٹ میں 21ویں صدی کے آثار ظاہر ہونا شروع ہوگئے ہیں۔

ماضی میں کئی دہوں سے اس رپورٹ میں پریس رجسٹرار کے "رجسٹرڈ" اخباروں کے اعداد و شمار دیے جارہے تھے۔ یہ سلسلہ دسمبر 2002 تک جاری رہا۔ تب تک یہ اعداد پورے گذشتہ کیلنڈر سال کے لیے دیے جاتے تھے لیکن 29 جون 2002 کے مرکزی وزارتِ اطلاعات و نشریات کے ایک اعلان کے مطابق اخبارات کے سالانہ کوائف مہیا کرنے کی مدت کو یکسانی مالی سال سے جوڑ دیا گیا ہے۔ چنانچہ تازہ ترین رپورٹ کے اعداد و شمار اپریل 2002 تا مارچ 2003 کے سال پر محیط ہیں۔

ان اعداد و شمار کے مطابق مارچ 2003 میں ملک میں رجسٹرڈ اردو اخباروں کی کل تعداد 2983 تھی جو 1957 کی تعداد سے قریب چھے گنا زیادہ تھی۔ اس کے مطابق یہ ملک کی کل 19 بڑی زبانوں میں ہندی (22067)، انگریزی (8141) اور مراٹھی (3138) کے بعد چوتھے نمبر پر تھی۔ اس رپورٹ میں مختلف زبانوں کے "رجسٹرڈ" اخباروں کے سرکولیشن کے اعداد و شمار نہیں دیے گئے۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ رجسٹریشن مقررہ ضابطے سے شروع ہونے والے ایک نئے اخبار کو پریس رجسٹرار کی طرف سے اندراج کی سند اور نمبر مل جانے کے بعد ہوجاتا ہے اور پھر جب تک یہ اخبار اپنے بند ہونے کے بارے میں خود کوئی اطلاع نہ دے اس کا نام سرکاری رجسٹر میں موجود رہتا ہے۔ غالباً مرکزی دفاتر اور ریاستی حکومتوں کے محکموں میں بند ہوجانے والے اخباروں کی اطلاعات فراہم کرنے اور آگے بڑھانے کا کوئی پختہ طریق کار نہیں ہے۔ چنانچہ بیسویں صدی میں جو رجسٹر بنا، اس میں شامل ہونے والے اخباروں کی تعداد بڑھتی رہی۔

اب 21ویں صدی شروع ہوئی تو غالباً بے روک اندراجات کی کثرت کا احساس ہوا۔ چنانچہ تازہ ترین رپورٹ میں اس پہلو کو وہ ترجیح نہیں دی گئی جو اسے گذشتہ رپورٹوں میں ملتی رہی۔ گذشتہ برسوں میں کئی دہوں سے رپورٹ کا آغاز رجسٹرڈ اخباروں کے ذکر اور تجزیے سے ہوتا رہا اور اعداد و شمار کے رجحانات اور نتائج اسی تجزیے سے اخذ کیے گئے۔ اس بار رپورٹ کے کل گیارہ ابواب میں سے دسواں یعنی تقریباً آخری باب "رجسٹرڈ" اخباروں کے لیے مختص کیا گیا ہے اور اس کے تجزیے کو سرسری سطح پر رکھا گیا ہے۔ "اخباروں کی تعداد" کا باب اس بار ناشروں کی طرف سے ملنے والے ان کے اپنے اخباروں کے بارے میں گذشتہ برس کے کوائف ہی پر مرکوز کیا گیا ہے۔ یہ سالانہ گوشوارہ بھیجنا ناشروں کا قانونی فریضہ ہے۔ چنانچہ موصول شدہ گوشواروں ہی پر اکتفا کرتے ہوئے اس باب میں اردو اخباروں کی کل تعداد

397 بتائی گئی ہے۔ اس فہرست کو اخبارات کی قریب قریب حقیقی تصویر کہا گیا ہے۔ مزید کہا گیا ہے کہ اس اقدام کا مقصد "اس رپورٹ کو زیادہ بامعنی دستاویز بناتا ہے۔" اس سے یہ تاثر اُبھرتا ہے کہ 2983 کی "رجسٹرڈ" تعداد میں سے 2586 نے اپنے سالانہ گوشوارے پریس رجسٹرار کو مہیا نہیں کیے۔ 2586 کے اعداد میں کتنا مبالغہ ہے اور کتنی حقیقت، اس کا جواب تو حکومت کے ذرائع ہی سے مل سکتا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہر سال تمام کے تمام ناشرین اپنے اخبارات کے کوائف کے سالانہ گوشوارے پریس رجسٹرار کو نہیں بھیجتے۔ یہ کوتاہی اردو ناشروں ہی پر موقوف نہیں بلکہ ہر زبان کے ناشروں سے متعلق ہے۔ چنانچہ رپورٹ کے مطابق ملک کی تمام زبانوں کے کل 55,780 "رجسٹرڈ" اخباروں میں سے صرف 7156 نے بروقت اپنے سالانہ گوشوارے بھیجے۔

یہ ایک ایسی صورت حال ہے جس سے پریس کے مشاہدین اور مبصرین کے لیے ابہام اور الجھاؤ پیدا ہوتا ہے۔ غالباً اس ضابطے سے وابستہ قانون (Press & Registration of Books Act) میں ترمیم کرنے کی ضرورت ہے جس سے مسلسل کوتاہی کرنے والے اخبار کو اشاعت بند تصور کرتے ہوئے سرکاری رجسٹر سے خارج کرنے کا اختیار مل جائے۔ لیکن اس معاملے کی شدت محسوس کرنے کے باوجود ابھی تک اس بارے میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں ہوا۔ البتہ اس کا احساس اور علم متعلقہ دفتر میں کماحقہٗ موجود نظر آتا ہے۔ اس معاملے میں صرف ایک مطبوعہ رپورٹ کا مبینہ مبالغہ ہی سامنے نہیں آتا بلکہ متعلقہ دفتر کا وقار بھی مخل نظر ہوجاتا ہے۔ چنانچہ تازہ ترین رپورٹ کے ساتھ اس کا ایک علاحدہ "دوسرا حصہ" بھی شائع کیا گیا ہے جو اس رپورٹ کی اس سال کی جدت ہے۔ اس میں پریس رجسٹرار کی چھان پھٹک کے بعد صرف ان اخباروں کی فہرست شائع کی گئی ہے۔ جنھوں نے 1997 تا مارچ 2003 کے پچھلے چھے سال کے دوران کم از کم ایک بار اپنے کوائف کا سالانہ گوشوارہ مہیا کیا ہو۔ اس تحقیق و تفتیش سے جو فہرست تیار ہوئی اس میں تمام زبانوں کے کل 12,349 نام ملے۔ یہ اعداد 55,780 کی رجسٹرڈ تعداد سے 43431 کی حد تک کم ہے۔ اس فہرست میں شامل ہونے والوں کو "زندہ" اخبار کہا گیا ہے۔

اس فہرست کا کوئی تجزیہ پیش نہیں کیا گیا۔ بس ملک کی تمام ریاستوں، یونین علاقوں اور علاقائی زبانوں کے تمام وقفوں کے کل اخباروں کے ناموں کا انبار لگا دیا گیا ہے۔ لہٰذا پریس رجسٹرار کی مستقل روایت کی پیروی میں ان کی ریاست وار، زبان وار اور وقفہ وار تفصیل کے باضابطہ انکشاف کا ہنوز انتظار ہے۔

راقم السطور نے اردو پریس کے تعلق سے جس دشت کی سیاحی وہ زائد از نصف صدی سے کر رہا ہے "زندہ" اخباروں کی اس فہرست سے اس کے صرف اردو اخباروں کی، ایک ایک کرکے تلاش کی تو ان کی تعداد 802 ملی۔ اس سے اردو پریس کی حد تک ایک اور قابلِ توجہ فہرست برآمد ہوئی جسے گو غیر رسمی لیکن بجا طور پر اسی 47ویں رپورٹ کا حصہ تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ اسے ملا کر پریس رجسٹرار کی تازہ ترین رپورٹ میں اردو صحافت کے متعلق تین فہرستیں سامنے آتی ہیں جو پریس رجسٹرار کے عنوانات کے تحت "رجسٹرڈ"، "حقیقی" اور "زندہ" زمروں میں شامل ہیں۔

ابھی تک یہ رپورٹ اخباروں کی "رجسٹرڈ" تعداد پر مبنی بار بار ہونے والے ہوش ربا اطلاعات کی امین تھی لیکن 21ویں صدی کے اوائل کی اس جدت سے اس ضابطے کے کئی گمشدہ پہلو آشکار ہوگئے ہیں۔ لہٰذا اب یہ رپورٹ ملک میں صحافت کے منظرنامے کو زیادہ بامعنی اور مقصد آفریں بنا سکتی ہے۔ اس سے یہ رپورٹ ایک اہم موڑ پر آگئی ہے اور اب اس کے آئندہ ایڈیشن سرگرم انتظار کا باعث ہوں گے۔

بہر حال رپورٹ میں اردو پریس پر جو باب ہے اس سے یہ خوش آئند خبر ملتی ہے کہ اس کے جن 397 اخباروں نے اپنے سالانہ گوشوارے مہیا کیے ان میں چار "بڑے" زمرے میں (فی شمارہ 75001 سے زیادہ اشاعت والے) شامل تھے۔ اردو پریس کا یہ ایک عدیم المثال ریکارڈ ہے۔ اس بڑے زمرے کا سب سے اوپر کا اخبار سری نگر کا روزنامہ "روشنی" ہے جس کا سرکولیشن، اس کے ناشر کی طرف سے 1,51,525 بتایا گیا ہے۔

حصولِ آزادی کے بعد ریاست جموں وکشمیر کے اردو پریس کا یہ عروج پہلی بار ہوا ہے اور یہ 21ویں صدی کے اوائل کے لیے ایک نیک فال ہے کہ ہندستان کی اس واحد ریاست میں، جہاں اردو سرکاری زبان ہے، اردو صحافت قابلِ رشک بلندیاں حاصل کر رہی ہے۔

رپورٹ کے اردو پریس کے باب میں مزید بتایا گیا ہے کہ اس کے 397 کے میزان میں 106 "میڈیم" زمرے کے (فی شمارہ 25001 تا 75000 اشاعت والے) اخبارات ہیں۔ یہ پیش رفت بھی بہت حوصلہ افزا ہے۔ بہر حال ناشرین کے اپنے سرکولیشن کے یہ تمام دعوے ابھی تصدیق طلب ہیں۔

اسی رپورٹ کے پچھلے سال کے (2002) ایڈیشن کے "پیش لفظ" میں کہا گیا تھا: "اس امر کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ اگر کسی اخبار کے ناشر کی طرف سے پانچ یا اس سے زیادہ کے مسلسل برسوں تک اس کا سالانہ گوشوارہ موصول نہ ہو تو یہ تصور کیا جائے کہ وہ اخبار شائع ہی نہیں ہوتا۔ لہٰذا اسے

سرکاری رجسٹر سے خارج کیوں نہ کیا جائے؟"

اب کوتاہی والے اخباروں کے اخراج کی اسی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے تازہ ترین رپورٹ کے "پیش لفظ" میں کہا گیا ہے کہ "زندہ اخباروں کی تازہ فہرست کی مدد سے ان اخباروں کو سرکاری رجسٹر سے خارج کرنے میں آسانی ہوگی جنھوں نے پچھلے چھے سال کی مدت میں اپنے کوائف کا کوئی گوشوارہ نہیں بھیجا۔ اس سے یہ تصور کیا جاسکے گا کہ وہ اخبار زیر اشاعت ہی نہیں۔"

اب سرکاری رجسٹر میں اخبارات کی بے جواز کثرت کو نظم وعمل کی سطح پر دور کرنے کا یہ حل پیش تو کر دیا گیا ہے لیکن اس رجسٹر سے اخباروں کے مجوزہ اخراج کے نتائج نہایت سنگین بلکہ تباہ کن ہو سکتے ہیں۔ اس پر عمل درآمد سے اردو کے سیکڑوں ایسے اخبارات جن کے پاس اقتصادی پسماندگی کی وجہ سے سالانہ کوائف کا گوشوارہ مرتب کرنے اور سرکاری محکمے کو بھیجنے کے لیے ذرائع نہیں ہیں، اپنی ہستی ہی سے محروم ہو جائیں گے اور ایسی محرومی اخبار کے کاروباری پہلوؤں کے لیے بہت نقصان دہ بلکہ مہلک ہوتی ہے۔ انھی خطرات کے پیش نظر اب تک متعلقہ دفتر کی طرف سے سرکاری رجسٹر کی غالباً متعلقہ اصلاح وترمیم نہیں ہوئی۔ رجسٹریشن کی سند رکھنے والے اخباروں کو رجسٹر سے خارج کرنے کے لیے قانونی منظوری بھی درکار ہوگی جس کے لیے PARB Act میں ترمیم کرنا اور اس اقدام کے لیے پارلیمنٹ کا تعاون حاصل کرنا ہوگا۔ لہٰذا اردو اخباروں کے ذمے داروں کو اپنے سالانہ گوشوارے بروقت بھیجنے کی طرف فوری اور باقاعدہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

اس کا ایک اور اہم زاویہ بھی ہے جو مختلف ریاستوں کی اردو اکادمیوں کی توجہ چاہتا ہے۔ اگر ہر اردو اکادمی اپنی ریاست کے موجودہ اردو اخباروں کی اس ضرورت کو پورا کرنے میں وسیع تعاون بڑھائے تو اردو زبان کے فروغ کے لیے یہ ایک بڑا مثبت اور تعمیری قدم ہوگا۔ ہر اردو اکادمی اپنی ریاست کے اردو اخباروں کی فہرست سازی کو اپنی مستقل سرگرمیوں میں بھی شامل کر سکتی ہے۔ بہتر اور مناسب ہوگا کہ متعلقہ تمام ریاستیں ان فریضوں کو اپنی اردو اکادمیوں کے دائرۂ عمل میں شامل کر دیں۔ ایسی حکمت عملی کی بدولت ہر اس ریاست میں بھی اردو اکادمی قائم ہو سکتی ہے جہاں اردو خواں لوگ اور اردو اخبارات تو ہیں لیکن کوئی اردو اکادمی موجود نہیں۔

G-46, Jangpura Extension,
New Delhi-110014

□□□

ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری

مصنف: پروفیسر گوپی چند نارنگ

یہ کتاب اس تاریخی سچائی کو مدلل اور پرزور انداز میں سامنے لاتی ہے کہ اردو ہی وہ زبان ہے جس میں استخلاص وطن کی لڑائی پورے جوش وخروش کے ساتھ لڑی گئی اور جس کے نغموں اور نعروں نے دلوں کو وہ ولولہ اور دماغوں کو وہ بصیرت عطا کی جس کی قوم کو ضرورت تھی۔

صفحات: 600، قیمت: -/300 روپے

آندھی (منظر نامہ)

مصنف: گلزار

اردو زبان میں فلمی منظر نامہ ایک نئی صنف ادب ہے۔ اسے بصری پیکروں کا ایسا سلسلہ کہا جا سکتا ہے جو کہانی کا روپ دھارن کر لے۔ فلم "آندھی" کا یہ منظر نامہ کملیشور کے ناول "کالی آندھی" پر مبنی ہے اور اس کا اسکرین پلے، مکالمے اور گیت گلزار کے قلم سے ہیں۔ اس کتاب کا مطالعہ مجموعی دلچسپی کا باعث بھی ہوگا لیکن اس کی اشاعت کا ایک مقصد ان طلبہ اور طالبات کی رہنمائی بھی ہے جو فلمی شعبے میں اپنا مستقبل بنانے کے خواہش مند ہیں۔

صفحات: 122، قیمت: -/65 روپے

تاریخ اور سماجیات

مصنف: عائشہ بیگم

تاریخ اور سماجیات علم کے دو مختلف گوشے ہیں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ تاریخ کا سب سے قریبی تعلق سماجیات سے ہے کیونکہ دونوں کا موضوع انسان، اس کا طرز عمل اور کردار ہیں۔ انسانی کردار کی داستان اس کے اخلاق وعمل اور آپسی تعلقات کی داستان ہے اور اخلاق وعمل کا انحصار بڑی حد تک ماضی کے تجربات پر بھی ہوتا ہے۔۔۔ اس کتاب میں اس اہم بحث کو بڑی خوبی کے ساتھ سمیٹا گیا ہے۔ طرز بیان استدلالی اور علمی ہے۔

صفحات: 140، قیمت: 51 روپے

جدید سیاسی فکر

مصنف: ڈاکٹر سید انوار الحق حقی، ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی

اس کتاب میں جدید سیاسی فکر کے پس منظر کے ساتھ ساتھ ان تمام سیاسی مفکروں پر گفتگو کی گئی ہے جنھوں نے اس مدت میں عالمی سیاست پر اثر ڈالا اور مختلف حکومتی نظاموں کی تشکیل یا استرداد دونوں کا موجب بنے۔ قدامت پسندی، افادہ پسندی، عینیت، شوتیت، قانونیت، اشتراکیت اور اس کے مختلف مکاتب فکر، سیاسی تکثیریت، مملکت مخالف نظریات، جمہوریت مخالف نظریات، مہاتما گاندھی کا عدم تشدد کا نظریہ اور سرودیہ تحریک۔۔۔ یہ کتاب ان تمام عنوانات پر سیر حاصل روشنی ڈالتی ہے۔

صفحات: 305، قیمت: -/120 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجران کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

نوشاد مومن

مغربی بنگال میں اُردو صحافت — آزادی کے بعد

29 جنوری 1780 کو انگریزی زبان میں "بنگال گزٹ" کی اشاعت کے ساتھ ہندستان میں صحافت کا آغاز ہوا۔ بنگال (کلکتہ) صرف انگریزی ہی نہیں بلکہ بنگلہ، فارسی، ہندی اور اردو صحافت کی جنم بھومی بھی رہا ہے۔ شانتی رنجن بھٹاچاریہ کی تحقیق کے مطابق کلکتہ سے بنگلہ کا اوّلین اخبار 1818 فارسی کا 1822 اور ہندی کا 1826 میں شائع ہوا۔ جہاں تک اردو صحافت کی ابتدا کا سوال ہے، اس ضمن میں ہفت روزہ "جامِ جہاں نما" کا ذکر ہوتا ہے، اب یہ الگ بات ہے کہ اس کے پہلے شمارے کی تاریخ اشاعت پر محققین کی آرا میں اختلاف ہے۔ کچھ اہل الرائے اس کے اوّلین شمارے کی تاریخ 27 مارچ تو کچھ 28 مارچ 1928 بتاتے ہیں جب کہ اُردو کے پہلے روزنامے کا شرف اردو گائیڈ کو حاصل ہے جو 1858 میں شائع ہوا۔

تاریخی حقائق جس امر کے شاہد ہیں کہ بنگال سے شائع ہونے والے بیش تر اخبارات روز اوّل سے کسی تجارتی نقطۂ نظر اور ذاتی مفاد کے پیشِ نظر نہیں بلکہ ایک خاص مشن کے تحت جاری ہوئے تھے۔ لہٰذا ان کی اشاعتی زندگی ایک طویل مسافت طے کرنے میں ناکام تو ضرور ثابت ہوئی لیکن اپنے مشن کے حصول میں انھیں کامیابی بھی ملی۔ ان اخبارات کے مقاصد کا اوّل مقصد ملک کو درپیش مسائل کا حل تلاش کرنا تھا تو دوم اہلِ وطن کو خود اعتمادی کے جذبے سے سرشار کرکے انھیں غلامی کی زنجیریں توڑنے اور آزاد ہندستان کی آزادانہ فضا میں زندگی گزارنے پر آمادہ کرنا تھا۔

اس طرح 19ویں صدی کے گزرتے ماہ و سال میں بنگال کے صحافی اپنے زورِ قلم سے سیاسی بیداری اور تحریکِ آزادی کے لیے جہاد کرتے رہے اور بیسویں صدی کی آمد کے ساتھ ہی اس میدانِ کارزار میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد اور عبدالرزاق ملیح آبادی جیسے وطن دوست صحافیوں کا ورود ہوا۔ 1911 میں مولانا محمد علی جوہر نے "کامریڈ" کا اجرا کرکے انقلاب کا سماں باندھا تو مولانا آزاد نے 13 جولائی 1912 میں "الہلال" اور پھر 12 نومبر 1915 "البلاغ" جاری کرکے اپنی علمی بصیرت، لامحدود معلومات، سیاسی شعور، طرزِ نگارش، چابک دستی، دور اندیشی اور بالغ نظری کے بل بوتے پر ذمے دارانہ صحافت کے بہترین نمونے پیش کیے۔ بعد ازاں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے مولانا آزاد کے اصولوں پر کاربند رہتے ہوئے صحافت کے اعلا نمونے پیش کیے۔ وہ اپنے زیرِ ادارت شائع ہونے والے اخبارات "پیغام" (جاری 23 ستمبر 1921) "پیام" (جاری 1927) اور "ہند" (جاری 1934) میں حکومتِ وقت کی غلط پالیسیوں کی نکتہ چینی کے ساتھ ساتھ قوم پرستانہ مسلم خیالات، ہندو مسلم اتحاد، کٹھ ملاؤں کی مخالفت اور سوشلسٹ خیالات کی وکالت کرتے رہے۔ یہ بنگال کی اردو صحافت کے بامِ عروج کا زمانہ تھا۔ 1947 میں تقسیمِ ملک کے ساتھ ہندستان کی 125 سالہ زرّیں صحافت کے روشن باب کا شیرازہ بکھر گیا اور قومی ہم آہنگی، بھائی چارگی، انسانی ہمدردی اور مذہبی رواداری کے سارے دعوے جھوٹے اور کھوکھلے ثابت ہوگئے۔ تقسیم کی وجہ سے بنگال کو عظیم نقصان اُٹھانا پڑا۔ ایسے حالات میں جہاں بنگال کے آسمانِ صحافت پر درد و کرب اور مایوسی کے بادل چھا گئے، وہیں عبدالرزاق ملیح آبادی نے ان مسموم حالات سے سینہ سپر ہوتے ہوئے عین یومِ آزادی کو ایک نیا اخبار ہفت روزہ "اُجالا" جاری کرکے نہ صرف اردو داں طبقے کی جانب سے آزادی کے استقبال کا اشارہ دیا بلکہ ملک کے سیکولر کردار پر اعتماد و یقین کے اظہار کی مثال پیش کرتے ہوئے نئے بنگال کی مٹی سے اُردو صحافت کی ازسرِنو آغاز کی راہ ہموار کی۔ نئے ہندستان میں بھی مغربی بنگال کے صحافتی منظرنامے پر حسبِ سابق اُردو اخبارات کی آمد کا سلسلہ برقرار تو ضرور رہا لیکن اس دور کے اکثر اخبارات کا مطمحِ نظر اب قوم و زبان کی خدمت نہیں بلکہ ذاتی مفاد بن کر رہ گیا۔

1947 تا 2004 بنگال میں اردو صحافت کی تاریخ کو گفتگو میں آسانی کے لیے چھ ادوار میں منقسم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا دور 1947 تا 1956، دوسرا 1957 تا 1966، تیسرا دور 1967 تا 1976، چوتھا 1977 تا 1986، پانچواں 1987 تا 1996 اور چھٹا دور 1997 تا 2004۔ صحافت کے اس پہلے دور میں تقریباً 13 اخبارات "آزاد ہند"، "کاروان"، "افکار"، "رہبر"، "انصاف"، "امروز"، "پیغام"، "نئی مجاہد"، "تلاش"، "رہنما"، "ستارہ"، "آبشار" اور "جمہور" جہاں روزنامے بن کر منظرِ عام پر آئے "وہاں"، "اُجالا"، "آفتاب"، "انگڑائی"، "عصرِ جدید"، "منزل"، "چیت"، "پرواز"، "ایک ہی راستہ"، "ساگر"، "طوفان"، "آگ کلکتہ"، "مہذل و نکلی"، "امن"، "قلم و نکلی"، "مزدور کی کہانی" وغیرہ ہم ہفت روزہ کی صورت میں جاری ہوئے۔ خط حیات، مزدور اور ریاض پندرہ روزہ تھے تو آوازِ مشرق، ضربِ کلیم، شاہین، کاروباری دنیا، کسوٹی، شعلہ، معاون، نشیمن، پیغام، دلچسپ، دلہن اور ارمغان ماہ نامے کی شکل میں شائع ہوئے۔ محولہ بالا اخبارات و رسائل میں سے چند ایک کو چھوڑ کر تمام اخبارات اپنے اقتصادی حالات اور

پریشانیوں کے باعث اپنا اشاعتی تسلسل برقرار نہیں رکھ پائے اس دور میں شائع ہونے والے اخبارات میں اُجالا، آزاد ہند اور آبشار ایسے ثابت قدم واقع ہوئے کہ نہ صرف ایک لمبی مسافت طے کی بلکہ آج بھی زندہ ہیں۔ اُجالا اور آزاد ہند کے ابتدائی ایڈیشنوں کی ادارت عبدالرزاق ملیح آبادی نے سنبھال رکھی تھی، بعد ازاں دونوں اخبارات کی ادارت کی ذمے داری ان کے لائق فرزند احمد سعید ملیح آبادی نے لے لی۔ "آبشار" کے پہلے اشاعتی دور کے مدیر ابراہیم ہوش تھے۔ چوں کہ اس کے مالکان اور مدیران آزادانہ خیالات اور ترقی پسند نظریات کے حامل تھے، لہٰذا اشتراکی رجحانات کو پروان چڑھانے میں وہ اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے رہے۔ کہتے ہیں کہ اس اخبار سے ابراہیم ہوش نے "کلکتیہ اردو" کو فروغ دیا اور اسے ایک ادبی زبان بنانے کی کوشش کی۔ اس دور کے دیگر اخبارات میں "الکارہ" اپنی سنسنی خیز خبروں کی اشاعت کے حوالے سے تاریخی حیثیت کا حامل تھا۔ اس کے ایڈیٹر عبدالوہاب غازی اپنے جوشیلے پن کی وجہ سے حکومتِ وقت کی نگاہوں میں معتوب قرار دیے گئے۔ دوسرے اخباروں میں "چیت" کو آزادی کے بعد پہلے مزاحیہ اور "عہدل ویکلی" کو کارٹونوں سے مزین پہلا اخبار ہونے کا شرف حاصل ہوا جب کہ فلمی خبریں شائع کرنے والا پہلا ہفت روزہ "فلم ویکلی" اور تجارتی اطلاعات وضروریات سے باخبر کرنے والا اوّلین ماہنامہ "کاروباری دنیا" ثابت ہوئے۔ ان کے علاوہ شائع ہونے والے دیگر اخبارات ورسائل اپنے اپنے مزاج کے مطابق، اپنا مطمحِ نظر واضح کرتے رہے اور دم لے لے کر صحافتی کارنامے انجام دیتے رہے۔

دوسرے دور کے دس برسوں میں اخوت، جمہور اور غازی روزنامے کی شکل میں شائع ہوئے۔ ہفت روزہ اخباروں میں کندن، آثار، ارمغان، رفتار عالم، مابدولت، پایل، صدائے حریت، آرزوئے ہند اور عکاس قابلِ ذکر ہیں۔ معمار، آرزو، اسپورٹس اور تفریح، اسپورٹس اور فلم، جامِ جنگ اور جام کوثر پندرہ روزہ کی شکل میں جاری ہوئے جب کہ ماہ ناموں کی فہرست میں کہانی، آفاق، اعلانِ نو، بزمِ ہند، ساز، حسن وصحت، اخوت، جہاں آرا، ندائے وطن، درودل، سوز، ساقی، فلم ریویو، فراز، ندائے وطن، فانوس، مجسمہ، شائل ملک، جام کوثر جدید، صدائے حریت اور روحِ ادب کے نام آتے ہیں۔ یہ عہد بھی اخبارات ورسائل کی خشک سالی کا زمانہ ثابت ہوا لہٰذا اس عہد میں جو روزنامے جاری ہوئے تو ان میں محمد واسم اور وسیم الحق کے زیرِ ادارت شائع ہونے والے اخبار "جمہور" کا دوسرا شمارہ شائع نہیں ہوا۔ "اخوت" جو ناظر الحسینی کی ادارت میں منظرِ عام پر آیا تھا، محض پانچ سال کے بعد بند ہوگیا۔ (پھر 1964 میں اسی نام سے وقار مشرقی کی ادارت میں یہ ماہ نامہ بن کر دوبارہ جاری ہوا) "غازی" جس کا آغاز 1965 میں عبدالوہاب غازی نے کیا تھا، وہ بھی میدانِ صحافت کی لمبی ریس کا گھوڑا ثابت نہ ہو پایا۔ بالآخر وقار مشرقی نے اسے خرید کر چند تبدیلیوں کے ساتھ اپنی ادارت میں شائع کیا تو ان کی یہ تبدیلیاں خوش گوار ثابت ہوئیں۔ اس عہد میں جاری ہونے والے دیگر اخبارات ورسائل سے پتہ چلتا ہے کہ ان دنوں کھیل کود اور فلم میں لوگوں کی خصوصی دل چسپی ہوا کرتی تھی۔ شاید اسی لیے ان کے ذوق کی تسکین کے لیے اسپورٹس اور فلم سے متعلق کئی اخبارات شائع ہوئے لیکن وہ بھی دیرپا ثابت نہ ہو سکے۔ اس دور میں "فانوس" کو ملک کے پہلے ڈائجسٹ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔

تیسرے دور کے آغاز میں بھی اُردو صحافت، نجات کا راستہ ڈھونڈنے میں ناکام ہی ثابت ہوئی۔ نتیجتاً اس دور میں صرف ایک روزنامہ "رہبر عالم" 1970 میں جاری ہوا جو ایک سال بھی شائع نہ ہوسکا۔ جب کہ ہفت روزہ اخبارات کی تعداد سابقہ ادوار کی بہ نسبت کم وبیش وہی رہی۔ اس دور میں تحریکِ ملت، جوکر، اسپورٹس اسکرین، ہوڑہ ٹائمز، نقشِ حیات، انجم، واسطہ، کسان مزدور، اسپورٹس ٹوڈے، مینار، محاذ، ندائے جنگ اور محرک نامی اخبارات جاری ہوئے۔ پندرہ روزہ اخباروں میں عکسیات، شہر جنگ وارتا، ہم لوگ اور تجزیہ اہمیت کے حامل سمجھے جاتے ہیں جب کہ ماہ ناموں میں تاج الفرقان، نگار عالم، جامِ نو، سبد گل، دیوار، شہود، آیات، اقدار، شیریں، نیا قدم، صدیقِ مصطفیٰ، اسپورٹس ٹوڈے اور روپ چھایا کا شمار ہوتا ہے۔ اس دور میں شائع ہونے والے ہفت روزہ سے پندرہ روزہ اور پھر روزناموں میں بھی تبدیل ہوئے۔ اس دور کے پندرہ روزہ اخباروں میں "عکسیات" واحد اخبار ثابت ہوا جس میں آج بھی آندھیوں میں چراغ جلانے کا حوصلہ باقی ہے جب کہ ماہ ناموں میں شہود عالم آفاقی مرحوم کا جاری کردہ رسالہ "شہود" کا اشاعتی سلسلہ عرصے تک جاری رہا۔ ظفر اُوگانوی کی زیرِ ادارت شائع ہونے والا ماہ نامہ "اقدار" اُردو داں حلقے میں کوئی خاص مقام نہیں بنا سکا۔ حالانکہ "اسپورٹس ٹوڈے" اور "اسپورٹس اسکرین" اپنے مخصوص قارئین کی وجہ سے کئی مہینوں تک شائع ہوتے رہے لیکن پابندیٔ اشاعت کی کمی کھلتی رہی۔

1977 تا 1986 کے چوتھے دور میں بنگال کی اُردو صحافت میں ایک انقلاب آیا۔ یہ انقلاب آفسیٹ چھپائی کا تھا۔ اس زمانے میں آفسیٹ چھپائی کا پہلا تجربہ وسیم الحق نے "اخبارِ مشرق" کے اجرا سے 1980 میں کیا۔ پھر "اقرا" بھی اسی تجربے سے 1983 میں گزرا۔ اس دور میں شائع ہونے والے دیگر روزنامے "شانِ ملت" (1979)، اور "مسلم یوتھ" (1985) شامل ہیں مگر "اخبارِ مشرق" کی انقلابی صحافت کے آگے یہ پردۂ سیمیں سے غائب

ہوگیا۔ "اخبار مشرق" کے اوّلین اداریہ نویسوں میں راقم لکھنوی کا نام آتا ہے لیکن 1981 میں احسن مفتاحی جب "اخبار مشرق" کے مدیر ہوئے تو اس میں نئی رُوح پھونک دی۔ انھوں نے اپنے دوٹوک اداریوں اور سنسنی خیز خبروں سے قوم کے ایک مخصوص اور بنیاد پرست طبقے کی نمائندگی شروع کردی۔ بعد ازاں 1983 میں عمر حیات خاں اور عبدالعزیز کی ادارت میں روز نامہ "اقرا" نئی سج دھج کے ساتھ منظرِ عام پر تو ضرور آیا لیکن دیرپا نہیں رہا۔ اسی عہد میں "اخبار مغرب"، "تسکین رُوح"، "لبیک"، "انقلاب"، "اسپورٹس اور فلم"، "فلم ویو"، "کسوٹی" وغیرہ ہم ہفتہ وار کی صورت میں نمودار ہوئے جب کہ "خوشبوئے ادب"، "علم و ادب"، "کہکشاں"، "ادب اور اسپورٹس"، "پیش رو"، "رہبر صنعت و تجارت"، "سمت"، "مفہوم"، "انکشاف"، "لب و لہجہ" اور "انشا" ماہ نامے بن کر منصۂ شہود پر آئے۔ پندرہ روزہ اخباروں میں "اسلامک ٹائمز" اور "نوائے حبیب" کی اشاعت ہوئی۔

1987 تا 1996 کی دس سالہ مدت میں DFNI کے زیرِ اہتمام روز نامہ "آبشار" سالک لکھنوی کی ادارت میں ایک مرتبہ پھر جلوہ گر ہوا۔ اس کے بعد "مدبر ہند" کی اشاعت ہوئی۔ اس عہد میں نئے اردو اخبارات کے اجرا کی رفتار میں قدرے کمی واقع ہوئی۔ لہٰذا اس مدت میں ایک پندرہ روزہ "نقشِ حیات" (1990)، تین ہفت روزہ "مہر الملک"، "بدلہ بدلہ لہجہ" اور "تسکینِ روح" جب کہ بچوں کا ماہنامہ "آج کا سکندر" شائع ہوئے اور وقت کے بے رحم ہاتھوں کا شکار ہوکر بند ہوگئے۔ اس عہد میں ادبی صحافت کی ایک خوش گوار فضا ہم وار ہوئی اور پے در پے کئی خالص ادبی رسائل جاری ہوئے۔ ان جریدوں میں "رابطہ" (1993)، تنویر افضل، نعیم انیس اور سید حیدر علی کی سرپرستی میں نذر الاسلام نظمی نے ارشاد آرزو کی معاونت سے شائع کیا۔ اردو ادب کے باذوق قارئین کے دروازے پر عنبر شمیم نے بھی 1994 میں "دستک" دی۔ نعیم انیس اور صباح اسماعیل نے مل کر 1995 میں "تجدید" اور شگفتہ طلعت سیما نے 'اثبات و نفی' 1995 میں جاری کیا۔ افسوس کا مقام ہے کہ نہایت سلیقے سے شائع ہونے والے ان خوبصورت اور معیاری رسالوں کے منتظمین اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود ان کے اشاعتی سلسلے کو برقرار رکھنے میں ناکام ثابت ہوئے۔

اس کے بعد شروع ہونے والا 20ویں صدی کا الوداعی دور تھا۔ 1997 تاحال شائع ہونے والا روز نامہ "شامِ مہانگر" 1998 میں جاری ہوا۔ 21ویں صدی میں ہفت روزہ اخبار جاری کرنے کی اوّلین کوشش راقم الحروف نے 2001 میں "نئی صدی" کے اجرا سے کی جس کے مدیر اعلا احسن مفتاحی تھے۔ پھر عشرت نظیر آزاد نے "نئی بستی"، نسیم احمد فائق نے "ہند ایکسپریس" جاری کیا۔ ان دنوں شائع ہونے والے دیگر ہفت روزوں میں "سیکولر آواز" اور "سہاہلہ" شامل ہیں۔ پندرہ روزہ اخباروں میں "صدائے آسنسول" اور "انشوراللہ" آسنسول سے جب کہ "آفاق" اور "غازیِ ملت" کلکتے سے شائع ہوئے۔ بعد ازاں "غازیِ ملت" لگ بھگ ایک ماہ تک روز نامے کی شکل میں شائع ہوتا رہا۔

1997 سے تادمِ تحریر کئی ماہ نامے وقفے وقفے سے دم توڑتے چلے گئے۔ ان میں "طالب علم"، "فکری جنگ"، "عاقبت" اور "عطائے قمر" کافی اہم ہیں۔ ان دنوں جو پندرہ روزہ کسی طرح شائع ہورہے ہیں، ان میں حکومتِ مغربی بنگال کا ترجمان "مغربی بنگال" مصطفےٰ اکبر کی معاونت سے شائع ہورہا ہے۔ ماہ ناموں میں ضیا برج سے "تطہیر" اور "ہمارا چمن" جب کہ "تصوف ملی"، "تجدید" اور "صارفین دوست" کلکتے سے نکل رہے ہیں۔ سہ ماہی جریدوں میں "انبساط" (آسنسول)، "عبیرِ نو" اور "ارض و سما" جب کہ مغربی بنگال اُردو اکادمی کا ترجمان "رُوحِ ادب" ابومحفوظ الکریم معصومی، قیصر شمیم اور رئیس احمد جعفری کی ادارت میں مسلسل چھپ رہا ہے۔ راقم الحروف اور سنجر ہلال بھارتی کی زیرِ ادارت "مژگاں" (1999) اپنی اشاعتی زندگی بچانے میں ہنوز کامیاب ہے۔ قیصر شمیم اور منور رانا کی سرپرستی میں فراغ روہوی، سید حسن، ارشاد آرزو اور محسن باعشن حسرت کی مشترکہ کوششوں سے "ترکش" کا اشاعتی سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ محمد علی اعظم خاں قادری بھی اختر رضا حبیبی اور شفیق الدین شایاں کے تعاون سے "حضرتِ بلال" کی اشاعت میں ابھی تک کامیاب ہیں۔ ضلع بردوان سے محبوب انور اور سہیل ارشد کی دیکھ ریکھ میں "نئی صبح" کی روشنی تیزی سے پھیل رہی ہے۔ جگدل سے بنگال کے پہلے انٹرنیٹ میگزین کے مدیر خورشید اقبال، قیوم بدر، نور اقبال، مشتاق انجم اور بلند اقبال کی معاونت اور اب اپنے پرنٹ ایڈیشن کی وجہ سے سہ ماہی رسالوں کی تاریخ میں اپنا نام درج کرالیا ہے۔

آزادی کے بعد مغربی بنگال میں شائع ہونے والے دو ماہی جریدوں میں پہلا جریدہ "نئے دھارے" یونس احمر کی ادارت میں اکتوبر 1947 میں شائع ہوا، پھر نیاز احمد خاں، ابراحمد اور طاہر علی نے مل کر 1959 میں "چراغِ راہ" جاری کیا۔ پروفیسر اعزاز افضل کی سرپرستی میں خورشید شیدائی نے 1966 میں "غنچہ" جاری کیا۔ 1971 میں ظفرِ دانش "گلدستہ" لے کر حاضر ہوئے۔ اختر بارک پوری نے "دستخط" کی رونمائی 1999 میں کروائی اور "تخلیق" ہوڑہ منصف علی اور قیم انور نے نکالا۔ ان دنوں اشاعت پذیر واحد دو ماہی رسالہ فیروز سلطان اعجاز المعروف بہ ف.س. اعجاز کا "انشا" ہے جو پہلے ماہ نامہ ہوا کرتا تھا اور بے حد مقبول تھا۔ اس دوران بنگال کے کچھ اہم

سال نامے بھی شائع ہوئے ہیں، ان میں کلکتہ یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو سے ''دستاویز'' ظفر اُوگانوی کی ادارت میں 1984 میں شائع ہوا تھا جس کا دوسرا سالانہ مجلّہ رواں سال میں ڈاکٹر شہناز نبی کی ادارت میں منظر عام پر آیا۔ جگتدل سے قیوم بدر نے ''صدف'' کے متعدد سال نامے پیش کیے۔ ''سحرالبیان ساحر'' کے نام سے کلیم آذر اور نسیم فائق نے 1997 میں سال نامہ شائع کیا۔ نیا برج سے بھی پرنس انجم قدر کی سرپرستی میں ایک سال نامہ ''محفل'' الف انصاری اور مشتاق جاوید نے مل کر ترتیب دیا۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کی صوبائی شاخ کے کوآرڈی نیٹر نعیم انیس نے اُردو یونیورسٹی کے طلبہ وطالبات کے لیے سال نامہ ''پرواز'' کا اجرا کیا۔ کلکتہ کی معروف درس گاہ مولانا آزاد کالج میں بھی وحشت کے زمانے سے ایک سالانہ مجلّہ شائع کرنے کی روایت قائم ہوئی تھی جس کی تجدید ایک طویل عرصے کے بعد تسلیم عارف نے 2000 میں ''آئینۂ خیال'' کے نام سے کی۔

آزادی کے بعد بنگال کی اُردو صحافت جس نشیب و فراز سے گزری، اس کے اجمالی جائزے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اُردو صحافت ہر دور میں سنگین بحرانوں سے نبرد آزما رہی ہے۔ تاہم چند اخبارات جو مغربی بنگال کی صحافتی روایت کی پاس داری میں اپنی ساری توانائی صرف کرتے ہوئے سرگرمِ عمل ہیں، ان میں بطور خاص ''آزاد ہند''، ''اخبار مشرق''، ''آبشار'' اور ''عکاس'' کی کاوشوں سے چشم پوشی چنداں ممکن نہیں۔

''آزاد ہند'' کے ایڈیٹر احمد سعید ملیح آبادی کو عبدالرزاق ملیح آبادی سے بے باکی اور صاف گوئی وراثت میں ملی ہے۔ ان کے اداریے میں توازن اور منصفانہ رجحان صاف جھلکتا ہے اور یہی خوبی کسی اخبار کی مقبولیت میں اہم رول ادا کرتی ہے۔ ''آبشار'' کے پہلے دور کی اشاعتی زندگی کے دوران اس کے اداریوں میں ابراہیم ہوش کے بیدار ذہن اور اشتراکی نظامِ حیات کی حرارت کا احساس ہوا کرتا تھا، جسے سالک لکھنوی نے بھی ''آبشار'' کے دوسرے دور میں بھی رکھا ہے۔ سالک لکھنوی کے اداریوں سے ان کی واقعات سے باخبری کا علم ہوتا ہے۔ بنگال کی صحافت میں رئیس الدین فریدی کا نامِ نامی ایک دستخط کی حیثیت رکھتا ہے۔ ''اخبار مشرق'' میں احسن مفتاحی کے تحریر کردہ اداریے جلالی کیفیت کے حامل ہوا کرتے تھے۔ ان کے اداریوں میں مسلم مسائل ''اُردو کاز'' ملکی سیاست، اور ریاستی حکومت کے غیر صحت مندانہ اقدام پر طنزیہ اشارے خصوصی اہمیت کے حامل تھے۔ مشرق سے علاحدگی کے بعد انھوں نے ہفت روزہ ''نئی صدی'' کے اداریے بھی خوب لکھے۔ ان کے رشحاتِ قلم سے ایک سچے محبِ وطن کے جذبات جھلکتے ہیں۔ حالیہ دنوں میں امریکی و اسرائیلی جبر و تشدد کے خلاف انھوں نے اپنے بے باکانہ اداریوں سے عوام کو باشعور کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ دیگر اداریہ نویسوں میں سید منیر نیازی، رئیس احمد جعفری، محمد وسیم الحق، کریم رضا مونگیری، انجم عظیم آبادی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

□□□

85J, Topsia Road, Kolkata-700039

اردو زبان کی تدریس

معین الدین

اردو کیسے پڑھی اور پڑھائی جائے درس و تدریس کے جدید سائنٹفک اصولوں کی روشنی میں تدریسی طریقۂ کار کا تعین طلبہ اور اساتذہ دونوں کے لیے یکساں مفید۔

پانچواں ایڈیشن

صفحات: 148 ، قیمت: 29.00 روپے

ہندستان کا شاندار ماضی

مصنف: اے ایل باشم

مترجم: سید غلام سمنانی

ہندستان کے قدیم تہذیب و تمدن کا مفصل اور مکمل تعارف مستند تاریخی شواہد کی روشنی میں

دوسرا ایڈیشن

صفحات: 748 ، قیمت: 145.00 روپے

اترپردیش کے لوک گیت

اظہر علی فاروقی

ہمارے لوک گیتوں میں ہندوستان کی عوامی زندگی کی بھرپور ترجمانی ہوئی ہے۔ اس کتاب میں اظہر علی فاروقی نے اترپردیش کے وہ تمام گیت یکجا کر دیے ہیں جو مختلف موقعوں پر عوام کے دکھ سکھ کی ترجمانی کرتے ہیں

صفحات: 652 ، قیمت: 120.00 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر.کے. پورم، نئی دہلی-110066

تحریر: جگدیش ایس. گنڈارا
ترجمہ اور تلخیص: اسلم پرویز

کثیر ثقافتی عالمی شہری سیاسی نظام میں لسانی رنگارنگی اور ہندستان میں اردو کی صورت حال

● سابق صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین کے ایک سو پانچویں یوم ولادت پر ڈاکٹر ذاکر حسین اسٹڈی سرکل اور موڈرن ایجوکیشن فاؤنڈیشن کی جانب سے حکومت نیشنل کیپٹل ریجن دہلی اور Konrad Adenauer Foundation کے اشتراک سے 8 تا 11/فروری 2002 کو نئی دہلی میں ایک انٹرنیشنل اردو کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا تھا. اس کانفرنس کے تحت انہی تاریخوں میں ایک بین الاقوامی سمینار بھی منعقد ہوا تھا، جس کا عنوان تھا: Minorities, Education and Languge in 21st Century Indian Democracy- The Case of Urdu with Special Reference to Dr, Zakir Husian, Late President of India. اس سیمنار میں مختلف موضوعات پر جو مقالات پڑھے گئے ان میں سے مندرجہ بالا عنوان کے تحت پروفیسر جگدیش ایس گنڈارا کے مضمون Linguistic Diversity in Global Multicultural Civic Polities The Case of Urdu in India کا ترجمہ تلخیص کے ساتھ یہاں پیش کیا جارہا ہے۔ پروفیسر گنڈارا International Centre for Intercultural studies Institute of Education, University of London میں UNESCO Chair in Intercultural studies پر ایجوکیشن کے پروفیسر ہیں۔

یہ انتہائی پیچیدہ اور سنجیدہ مضمون انہماک کے ساتھ پڑھے جانے کا مطالبہ کرتا ہے اس لیے کہ اس میں اردو کے مسئلے کو اس اقتصادی گلوبلائزیشن کی تعبیرات کے سیاق میں دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے آج ساری دنیا خصوصاً کمزور ممالک، قومیں، ان کی ثقافتیں اور ان کی زبانیں جس کی لپیٹ میں ہیں۔

اس مضمون میں حالیہ عالمی تناظر میں لسانی رنگارنگی کا جائزہ لیا گیا ہے۔ عالمی سطح پر انگریزی کے رول سے بحث کرتے ہوئے "Economist" London لکھتا ہے:

"جب کوئی زبان زیر بحث ہو تو ایسا شاذ ہی ہوتا ہے کہ اس میں فخر کا عنصر شامل نہ ہو۔ اس لیے کہ کسی زبان کی کامیابی یا ناکامی کا دارومدار اس زبان کی فطری خوبیوں پر نہیں ہوتا۔ ہر بات اس پر منحصر ہے کہ وہ لوگ کتنے طاقت ور ہیں جو یہ زبان بولتے ہیں اور آکسفورڈ یونی ورسٹی کے پروفیسر JEAN ATICHSON کے قول کے مطابق یہ بات خاص طور پر انگریزی پر صادق آتی ہے"۔[1]

1908 میں مہاتما گاندھی نے پُرزور انداز میں یہ بات کہی تھی کہ "لاکھوں لوگوں کو انگریزی کی تعلیم دینے کے معنی انھیں غلام بنانا ہے"۔ موجودہ زمانے میں ملائم سنگھ یادو اسی جدوجہد میں مبتلا ہیں کہ انگریزی کو ہندستان سے نکال باہر کیا جائے۔ دوسرے لوگوں کا کہنا ہے کہ ایک ایسے ملک میں جہاں آٹھ سو زبانیں اور بولیاں رائج ہیں پوری قوم کی تکمیل انگریزی بولنے والے ایک نی صد طبقے کے ہاتھ میں ہے۔

یہ پیچیدہ اور متضاد میراث، خاص طور پر آج کے اقتصادی گلوبلائزیشن کے زمانے میں عالمی سطح پر درپیش گوناگوں لسانی مسائل کی طرف اشارہ ہے۔

ترسیل کی کلیدی زبان کی حیثیت سے انگریزی کے استعمال سے جس طرح کا دباؤ پڑتا ہے وہ نہ صرف انگریزی کی مقامی اور علاقائی شکلوں کے لیے ایک خطرہ ہے بلکہ عمومی طور پر دوسری کاروباری زبانوں اور دوسرے لسانیاتی نظاموں کے لیے بھی چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ لہٰذا زبانوں سے متعلق قومی پالیسیوں کی تشکیل کی سطح پر اتفاق رائے کی ایسی راہیں ہموار کرنے کی ضرورت ہے جو نہ صرف یہ کہ معقول ہوں بلکہ جن سے مختلف لسانی فرقوں کو نظر انداز کرنے یا ان کے شدید ردِعمل کا سامنا کرنے کی صورت حال کا بچاؤ بھی ہوسکتا ہو۔

ہندستانی سیاق میں عالمیت (Global) میں ایک لسانی چیلنج بھی پوشیدہ ہے۔ ایسا اس لیے ہے کہ بہت سی زبانیں جن میں اردو بھی شامل ہے ایسی ہیں جنھیں غیر ممالک میں آباد ہندستانی بھی بولتے ہیں۔ حکومت کو اس بات پر غور کرنا ہوگا کہ کس طرح صلاحیت، معلومات ہمہ گیر قوت کی حامل اجنبی دیسوں میں آباد ہندستانی (diaspora) آبادی ہندستان کے قومی سیاسی نظام (National polity) کا وقار بلند کرسکتی ہے۔

بہت سی حکومتیں اقلیتی زبانوں تک اس لیے نہیں پہنچتیں کہ انھیں اس بات کا ڈر ہوتا ہے کہ اس سے کہیں علاحدگی کے مطالبات نہ شروع ہوجائیں۔

ایسی صورت حال میں قومی سطح کے معاہدوں اور تعلیم کے سلسلے میں مفاہمت پسندانہ ردِعمل کی ضرورت ہے۔ دوسری زبانیں سکھانے کے بے پناہ وسائل اور مہارتیں بھی رکاوٹ کا سبب بن سکتے ہیں۔ تعلیمی نقطۂ نگاہ سے مندرجہ ذیل معاملات پر توجہ دینی ضروری ہے:

(الف) جیسا کہ اوپر کہا گیا زبان کو کھونے سے روکا جائے۔
(ب) ابتدائی منزل میں پہلی زبان بچے کے لیے سیکھنے کا سب سے موثر ذریعہ ہے۔ اس پہلی زبان میں خواندگی حاصل کرنے ہی سے دوسری زبان میں خواندگی حاصل کرنے کا راستہ کھلتا ہے۔ (ج) پہلی زبان کا حصول اور ترقی ہی دوسری (غالب، قومی، اکثریتی یا رابطے کی) زبان کے حصول کو کامیاب بنانے میں مدد کرتی ہے۔ اس طرح پہلی زبان سے دوسری زبان کے حصول کو بڑھاوا ملتا ہے نہ کہ وہ اس کے لیے مزاحم ہوتی ہے۔ (د) ایک مدرسے یا کسی گروہ کے بارے میں اس خیال کو فروغ دیا جائے کہ وہ گروہ اس کی زبان، اس کا علم اور اس کی اقدار ہماری اپنی ہیں۔ پہلی زبان کا استعمال ایک مشترکہ کلچر کے فروغ کے لیے سودمند ہے۔ دوسری زبانوں کے بچوں کو ان کے کلچر اور تاریخ کو اسکول اور اس کے نصاب سے منقطع کر دینا اس صورت میں اور بھی مشکل ہوگا اگر ان کی زبانوں اور ان کے کلچر کا استعمال Mainstreem اسکولوں میں ہو رہا ہے۔

ہندستان میں اردو کو درپیش معاملات

میں اس عالمانہ اور اہم کانفرنس میں ایک مہجری ہندستانی کے قدرے ذاتی قسم کے نقطۂ نظر کو آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔ میرا تعلق ایک ایسے سکھ خاندان سے ہے جو کینیا ہجرت کر گیا ہے۔ ایک نوعمر لڑکے کی حیثیت سے میرے پُر افتخار، قابلِ احترام، باریش اور پگڑی پوش والد کی انگریزی، فارسی، اردو اور پنجابی بولتی ہوئی شخصیت میرے لیے معمہ تھی۔ وہ کینیا کی دو اہم زبانیں سواحلی اور کی کو یو بھی بولتے تھے۔ ان کے دوست اردو کا ذکر ایک ایسی زبان کی حیثیت سے کرتے تھے جس کی پیدائش اور پرورش ہندستان کی مٹی میں ہوئی تھی جو حقیقی معنوں میں وقت کا ساتھ دینے والی اور ایک سیکولر زبان تھی اور اس لیے وہ ایک بین ثقافتی تفہیم کے امکانات کا بھرپور اشاریہ تھی۔ میرے والد کا تعلق اس نسل سے تھا جس کے لوگوں میں ایک طرف تو انفرادی استحکام تھا اور دوسری طرف جو معاشرے میں اپنے مقام کا شعور رکھتے تھے۔ مشرقی افریقہ کی اگلی نسل کے مہجری ہندستانی بچے برصغیر کی اپنی اکثر زبانوں کو فراموش کر چکے ہیں اور بس گھریلو قسم کی سواحلی بولتے ہیں۔ برصغیر کی ان نسلوں کے زیادہ تر لوگ یک لسان ہیں اور ان کی یہ واحد زبان انگریزی ہے ان میں بہت لوگ ایسے ہوں گے (وہ بھی اکثریتی) جو برصغیر کی زبانوں اور ان کے ادب کی یادیں اپنے ساتھ رکھتے ہوں گے۔

میری نسل کے لوگوں کو اپنے ہندستانی ہونے پر ناز تھا خاص طور پر کینیا کی نسل پرست نوآبادیاتی سوسائٹی کے سیاق میں۔ ہندستان ہماری نظروں میں (اپنی تاریخی اور تہذیبی دولت سے مالا مال) ایک ہمہ جہت ملک تھا جس کا ایک انتہائی شاندار سیکولر پولیٹکل آئین تھا اور آزادی کے بعد کا نیا نظامِ عمل تھا۔ میٹروپولیٹن شہروں کی جانب ان مہجری ہندستانی فرقوں کی یورش سے ایک متضاد قسم کی صورت حال نمو پذیر ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ بڑھتی ہوئی یک لسانیت کے سبب ہندستانی اصل کے سیکولر لوگوں میں فرقہ واریت تیزی سے راہ پا رہی ہے۔ چناں چہ جو لوگ اپنی زبانوں، اپنے مذہب اور اپنے کلچر سے بے بہرہ ہو چکے ہیں ان میں بڑھتی ہوئی یہ فرقہ واریت اپنی شناخت کے ان بنیاد پرستانہ تصورات کی طرف واپس جانے کی کوشش ہے جو دراصل کھوکھلی قسم کی انگریزیت کے خلاف ایک ردِعمل ہے۔ کیا اس مہجری مشاہدے میں ہندستان جیسے ملک کے لیے کوئی سبق ہے۔ ایک ایسی لسانی علاحدگی پسندی جو صرف ایک گروپ سے مخصوص ہو ایک رجعت پسندانہ اقدام ہے۔ چناں چہ اگر پنجابی کو صرف سکھوں کی، ہندی کو صرف ہندوؤں کی اور اردو کو صرف مسلمانوں کی میراث کے طور پر دیکھا جائے گا تو اس سے ان مختلف ہندستانی نژاد لوگوں کے درمیان زبان کے استعمال کے اس گذشتہ زیادہ طاقت ور اور مشترکہ استعمال کو دھکا لگے گا جس نے مہجریت کے دوران بھی اپنی کثیر لسانی حیثیت کو برقرار رکھا تھا۔ ہندستان ایک سیکولر، ہمہ جہت اور جمہوری ملک ہونے کی حیثیت سے اپنی کثیر لسانی بنیاد پر اس تفریق سے خود کو محفوظ رکھ سکتا ہے۔ ڈیموکریسی، انسانی حقوق اور ہندستان کے سیاسی نظام کے تحفظ کے نقطۂ نظر سے یہ معاملہ بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ فیڈرل اور صوبائی حکومتیں اس بات کی ضامن ہوں کہ اردو ملک کی مسلمان شہریت کے ہم معنی ہو کر نہ رہ جائے۔ اگر مسلمانوں کو اردو صرف ان مدرسوں میں پڑھنی پڑتی ہے جو مسجدوں سے ملحق ہوتے ہیں تو زبان صرف مذہبی کارکردگی کا آلہ ہو کر رہ جائے گی۔ برطانیہ میں اردو، پنجابی اور ہندی کو مین اسٹریم اسکولوں میں نہ پڑھانے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ یہ زبانیں ڈھکار کر اس متبادل اسکولی نظام میں دھکیل دی گئی ہیں جنھیں مسجدیں اور مندر مدد بہم پہنچاتے ہیں۔ برطانیہ کی پبلک لائف میں زبانوں کا ادبی، متحدہ اور سیکولر کردار اب معدوم ہو چکا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ صورت حال ہندستان کے تعلیمی نظام کے لیے سبق آموز ہو اور یہاں اس بات کی کوشش کی جائے کہ لسانی رنگا رنگی کو اکادمک مقاصد کی خاطر تخلیقی طرز پر فروغ دیا جائے اور قومی اتحاد کے لیے اسے موثر آلۂ کار اور قوت کے طور پر دیکھا جائے۔ بچوں کی لسانی طاقت کے فروغ کے لیے اردو کی تعلیم کو نرسری اور پرائمری اسکولوں میں فروغ دیا جائے۔

اردو پڑھنے کے مواقع نہ صرف ان طلبہ کو حاصل ہونے چاہئیں اردو جن کی پہلی زبان ہے بلکہ ان کو بھی جن کی اردو پہلی زبان نہیں ہے۔ اس سے پہلی زبان اردو کے طالب علموں کو ایک بڑی سہولت اس بات کی بھی حاصل ہوگی کہ وہ دوسری اور تیسری زبانیں بھی سیکھیں گے خواہ یہ زبانیں ہندی، انگریزی یا کوئی سی بھی دوسری علاقائی زبانیں کیوں نہ ہوں۔ اس حکمتِ عملی سے ان طلبہ میں ایک بین ثقافتی سمجھ پیدا ہوگی جن کی اردو پہلی زبان نہیں ہے۔

اترپردیش جیسی ریاستوں میں جہاں اردو کا ایک عظیم تہذیبی اور ادبی ورثہ ہے وہاں اردو کے تعلیمی نظام کو نرسری، پرائمری اور سیکنڈری سطح پر اس نہج پر فروغ دیا جائے کہ اس سے اردو کا مرتبہ کم نہ ہو۔ دراصل اس بات پر بجا طور پر زور دیا جاسکتا ہے کہ سیکولر ہندوستان کے سیاق میں اردو زبان کا مرتبہ برتر ہی ہونا چاہیے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اردو اس چیز سے عبارت ہے جسے ہم اس کا برصغیر کردار کہہ سکتے ہیں اور یہ ایسے لوگوں کے درمیان رائج ہے جو علاحدہ علاحدہ پس منظروں کے مالک ہیں۔ اس طرح اردو کے اس برتر مرتبے سے اردو والوں کو یہ موقع ملے گا کہ ہندوستان کی تہذیب کو فروغ دیتے ہوئے وہ اردو کی ادبی اور اکادمک حیثیت کا درجہ نہ صرف قومی سطح پر بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی بلند کریں گے۔ اس کے مثبت اثرات آرٹ، ڈراما اور سنیما انڈسٹری تک پہنچیں گے اور جہاں تک کامرس، تجارت اور خصوصاً پبلشنگ اور میڈیا صنعتوں کا تعلق ہے وہاں تو اس کے فوائد متواتر اور بے پناہ ہوں گے۔ دوسرے یہ کہ مین اسٹریم میں اردو کی تعلیم سے اردو کو ایک سیکولر سیاق میں فروغ حاصل کرنے کے مواقع ملیں گے اور ہندستانی مسلمانوں میں احساس پیدا ہوگا کہ ان کی زبان اور تہذیب کی قدر ملکی شہریوں کی طرح کی جارہی ہے۔ اس طرح مین اسٹریم اسکولوں میں اردو کی تعلیم سے ان مدرسوں کے حوصلے پست ہوں گے جو نفاق یا علاحدگی پسندی کی بنیاد پر چل رہے ہیں۔ برطانیہ میں مہجری زبانوں اور تہذیبوں کو نظر انداز کرنے کے نتیجے میں 'محصور فرقوں' (Siege Communities) اور 'محصور ذہنیتوں' (Siege menlatatties) کو فروغ حاصل ہوا ہے۔ نظر انداز کردینے کے ایسے رویے کو پھیلنے سے روکنے کے لیے اس سے پرہیز اور حذر لازمی ہے مبادا کہ اس سے ہندستانی مسلمانوں جیسے فرقے میں نظر انداز کیے جانے کا احساس فروغ پائے۔ آخر کو اردو کا تعلق ہندستان کی اُن سب سے اوپر کی نصف درجن زبانوں سے ہے جو پورے ملک میں بولی جاتی ہیں۔

مین اسٹریم اسکولوں میں اردو کی تعلیم سے اردو کے مرتبے میں اضافہ ہوگا جس سے پورے ملک کا اور خصوصاً ہندستان کے مسلم فرقے کا اعتبار بڑھے گا۔ اگر اردو صرف غریب تر مسلمانوں ہی کی زبان ہوکر رہ گئی تو مسلمان فرقے کے دولخت ہوجانے سے نفاق کے رجحان کو فروغ حاصل ہوگا جس سے ایک غیر مستحکم سماجی صورت حال پیدا ہوگی۔ اس طرح کی غیر مستحکم صورت حال کے نتیجے میں منحرف لوگوں کا ایک اتنا بڑا گروہ وجود میں آسکتا ہے جنھیں ہندستانی کی حیثیت سے نہیں دیکھا جائے گا اور جو اپنی خاص سوچ کو انتہائی پیچیدہ مسلم فرقے اور اس کے گوناگوں مفادات پر منطبق کرنا چاہیں گے۔

اگر اس بات پر بھی اصرار کیا جائے کہ مادری زبان کی حیثیت سے اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے تو ہمیں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ آج ہندستان کی آزادی کو پچاس سال بیت چکے ہیں اس اعتبار سے یہ ضروری ہے کہ عام پالیسیاں اس بات کی ضامن ہوں کہ دوسرے گروہوں کی طرح اس فرقے کو بھی ملک کے سیاسی نظام میں دوسرے شہریوں کے مساوی سمجھا جائے۔ اردو نے برصغیر میں ایک زبان کی حیثیت سے ادب، اکادمک مضامین، تجارت اور کامرس کے شعبوں میں زبردست رول ادا کیا ہے اور اس میں مہجری آبادی کا بھی اہم رول رہا ہے۔ ان غیر سکونت پذیر ہندستانیوں (N.R.I.S) میں بہت سے ایسے ہیں جو اردو بولنے والے ہیں اور ہندستان کی زندگی کے تمام شعبوں میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ تمام ہندستان میں ایسی متحدہ پالیسیاں وضع کی جائیں جن میں یہ دیکھا جائے کہ ان پالیسیوں کے اثرات مہجری فرقوں خصوصاً غیر سکونت پذیر ہندستانیوں (N.R.I.S) تک پہنچ رہے ہوں۔ یہ مہجری گروہ اصولی طور پر ڈیموکریٹک اور سیکولر ہیں جن کے سینے ہندستان کی پُر جوش ناسٹلجیا یادوں کا دفینہ ہیں۔ تاہم اس بات کا خیال رکھتے ہوئے کہ یہ رویے ترش نہ ہوجائیں ہندستان کی پبلک پالیسیاں منصفانہ ہوں اور ان کے اطلاق کا مقصد ملک کے تمام شہریوں کے ساتھ مساوات برتنا ہو۔

دراصل ضروری یہ ہے کہ پبلک پالیسیوں کی تعلیمی جہات میں اس بات کا خیال رکھا جائے کہ اردو کا استعمال صرف مسلمانوں تک محدود ہوکر نہ رہ جائے بلکہ ایسے اقدامات کیے جائیں جن سے دوسرے یہ محسوس کرسکیں کہ ایک قابلِ اعتنا حکمتِ عملی ہے، ایک بہت ہی سیدھا سادا یہ تصور کہ مسلمان کے معنی اردو اور اردو کے معنی غیر محبِ وطن ہیں نہ صرف یہ کہ ایک خاص فرقے کے لیے بلکہ پورے ملک کے لیے مضرت رساں ہے۔ Madhar Godbole نے ترانوے ویں ترمیم کے تعلق سے لکھا ہے:

''نئے سرکاری اسکول کھولتے ہوئے ایسے علاقوں کو ترجیح دی جانی چاہیے جہاں مسلم وافر تعداد میں آباد ہوں بصورتِ دیگر ان علاقوں کو نظر انداز کردینے کا مطلب مدرسوں کا فروغ ہوگا۔''[2]

حکومت کی اردو کو نظر انداز کرنے والی پالیسیوں کے نتائج بڑے خراب ہیں اس کے مقابلے شمولیت کے ایسے اقدام جو اس بات کے ضامن ہوں کہ اردو زبان اور ادب کے سیکولر مزاج میں سب حصہ لائیں، قابلِ قدر ہیں۔

اس طرح کی متحدہ پالیسیوں کے مثبت اثرات بے پناہ امن اور سماجی استحکام کے حامل ہیں۔ اس اعتبار سے تحقیق اور ترقیاتی کارکردگی خصوصاً نصاب کے تعلق سے انتہائی ضروری ہے۔ یہاں ساتھ ساتھ اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ تعلیمی طور پر اساتذہ اس لائق ہوں جو زبان کی تدریس کے جدید ترین طریقہ ہائے کار سے واقفیت رکھتے ہوں اور ان کی اس مہارت کے دائرے میں نرسری، پرائمری سبھی اسکول آتے ہوں۔ اس طرح کے اقدامات سے اردو میں تعلیم کے رواج کو فروغ حاصل ہوگا نہ کہ یہ انھیں محض اس طرح پڑھایا جائے کہ وہ بس رٹ کر اپنا سبق یاد کرلیں۔ اس کام کے لیے ایسا تعلیمی سامان اور کتابیں بھی اتنی ہی ضروری ہیں جو نہ صرف جاذبِ نظر ہوں بلکہ ہم عصر زندگی سے علاقہ بھی رکھتی ہیں۔ اس طرح کے کام کا دائرہ محض علی گڑھ جیسی یونی ورسٹیوں تک نہ ہو بلکہ اعلا تعلیم کے ملک بھر کے تعلیمی مراکز کو اس میں شامل کیا جانا چاہیے۔ ہم عصر ہندستان میں ریاستی پالیسیوں کا رول یہ ہونا چاہیے کہ آبادی کے سیکشن کی جدید کاری کریں تاکہ مختلف گروپوں کے درمیان فاصلے اور نابرابری کی صورتِ حال میں زیادہ سے زیادہ کمی واقع ہو۔ مثال کے طور پر اگر غریب اور متوسط طبقے کے درمیان یا شہری اور دیہاتی مسلمانوں کے درمیان زیادہ فاصلہ برقرار رہتا ہے یا اور بڑھ جاتا ہے تو اس سے مسلمانوں کے لیے ایک غیر مستحکم صورتِ حال پیدا ہوگی اور اسی کے ساتھ دوسرے گروہوں کے لیے بھی غیر مستحکم صورتِ حال پیدا ہوگی۔ لہٰذا ایسے میں مسلم قائدینِ دین کی جانب سے ان اسکولوں کے خلاف کوئی فتویٰ جاری کردیا جانا مناسب نہیں جو عیسائی اسکول کہلاتے ہیں اور Convent کی اصطلاح کا استعمال بشمول مسلمانان تمام طالب علموں کے لیے محض اس لیے کرتے ہیں جس سے تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کی تعداد میں اضافہ ہو۔[3]

لسانی رنگا رنگی کی صورتِ حال معاملے کی تہ سے ایک اور معاملے کو اٹھاتی ہے۔ ڈیموکریٹک سوسائٹیوں میں لسانی فرقوں کو مسلمہ طور پر اپنی زبان کے تحفظ کا حق حاصل ہے اور یہ ذمے داری حکومت کی ہے کہ وہ انھیں اس بات کی ضمانت دے۔ ہندستان کے مسلم فرقے کی موجودہ نازک صورتِ حال اور مدرسوں کی وہ بھاری تعداد جنھیں کہ مسلم فرقہ چلاتا ہے، ضروری طور پر اس بات کی متقاضی ہے کہ مقامی سطح پر اس معاملے میں مسلم فرقے اور حکومت کے درمیان مکالمہ ہو جس کے ذریعے یہ یقین دہانی کرائی جائے کہ اس طرح کے اداروں میں اردو کی تعلیم صحیح تعلیمی مواد اور ماہر اساتذہ کے ذریعے دی جائے گی۔ ناتجربہ کار اساتذہ اور گھٹیا تعلیمی مواد سے طلبہ تخلیقیت سے تو کیا سرے سے زبان سیکھنے ہی سے جائیں گے۔ اس طرح مقامی مشاورتی طریقۂ کار سے آگے پھر حقیقی ڈیموکریٹک مشینری کو اپنا کام سنبھالنا چاہیے جو اس بات کی ضامن ہو کہ زبان کی تعلیم میں کم از کم اوسط درجے کے اکادمک معیار کا خیال ضرور رکھا جائے جسے حقیقی ڈیموکریٹک مشاورت کے ذریعے ایک باضابطہ شکل دی جائے۔ اس طرح کے مشاورتی اور فیصلہ کن طریقۂ کار کو اس بات کا ضامن ہونا چاہیے کہ اردو بولنے والے غریب تر دیہی اور شہری فرقوں کو ایسی تعلیمی ترجیحات وضع کرنے کے کام میں شامل کیا جائے جن کا مقصد عالمی سطح پر پرائمری تعلیم کا وہ لائحۂ عمل تیار کرنا ہو جو اقوامِ متحدہ کے منصوبوں کی تکمیل میں مدد کرسکے۔ یعنی ایسے طریقہ ہائے کار جن کا مقصد محض اردو سکھانا ہی نہ ہو بلکہ جن کا مقصد دوسرے تعلیمی اقدامات کے ذریعے فرقوں کی لڑکیوں اور عورتوں کو نظرانداز کرنے کے بجائے خواندہ بنایا جائے تاکہ ایک طرف تو تعلیمی نشانے پورے ہوں اور دوسری طرف غریب تر فرقوں کی حالت بہتر ہو۔ ان مہارتوں میں اردو زبان کے رسم الخط کو لکھنا اور پڑھنا بھی شامل ہیں بلکہ عام طور پر اعداد شماری اور عام تعلیم بھی ہیں۔ اس طرح کی تدبیر سے اس صورتِ حال کو الٹا جاسکتا ہے جس کے بارے میں سید شہاب الدین سہ لسانی فارمولا یعنی ہندی، انگریزی، سنسکرت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''یہ دیکھتے ہوئے کہ نوے فی صدی پرائمری تعلیم سرکاری یا میونسپل اسکولوں کے ذریعے دی جارہی ہے اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں کہ جب جڑ ہی کٹ جائے گی تو پھر فصل کو پانی دینے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اردو بولنے والے فرقے کو ہر ریاست میں دوسری لسانی اقلیتوں کے ساتھ مل کر اس ناانصافی کے خلاف لڑنا ہوگا''۔[4]

اس طرح کی حکمتِ عملی سے نہ تو ہندستان ہی کا کوئی فائدہ ہوگا اور نہ اردو بولنے والے فرقوں کا۔ مقامی سطح کی مشاورت اور فرقوں کو آپس میں جوڑنے کے لیے متحد رہنے کی کارکردگی، مین اسٹریم اسکول اور اردو بولنے والے ہی ایک محفوظ، مستحکم، پُرامن اور باہمی طور پر طاقت ور سیاسی نظام کو جنم دے سکتے ہیں۔

ایک ایسا مشاورتی عمل ہی جو مسئلے کی کوکھ سے جنم لے اس لائق ہوسکتا ہے کہ وہ مقامی اسکولوں میں مسئلے کے حل کی بنیاد فراہم کرسکے خواہ یہ مین اسٹریم اسکول میں ہوں یا مدرسے میں۔ مدرسوں اور ریاستی اسکول کے درمیان ربط قائم رکھنا بھی ضروری ہے تاکہ مسائل اور معاملات پر مل جل کر سوچا جاسکے اور ان سے نمٹا جاسکے۔ اس طرح کا مشاورتی طریقۂ کار اس بات کا ضامن بھی ہوسکتا ہے کہ پریکٹس کا ایک ایسا ماڈل اختیار کیا جاسکے جس سے بشمول اردو، زبانوں کی تعلیم کی پریکٹس عام ہوسکے۔ اسکولوں اور فرقوں کے درمیان خیالات کے لین دین، تبادلے مدرسوں کی اور زبان کی حیثیت سے اردو کی علاحدگی کا تدارک ہوسکتا ہے۔ تمام غریب دیہاتی فرقوں کو خاص طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں کو مقامی پنچایتوں کے ذریعے دباؤ بنانا چاہیے، اس طریقۂ کار سے بین ریاستی اور قومی مشاورت کو فروغ حاصل ہونا چاہیے جس

کے نتیجے میں مشاورتی اور پالیسی ساز ادارے اور طریقہ کار وجود پذیر ہوں۔

پریشانی کی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین اور نہرو سمیت اور بہت سے لوگوں کی کوششیں جن میں آل احمد سرور، اندر کمار گجرال اور سردار جعفری کی سرکردگی میں کام کرنے والی کمیٹیاں بھی شامل ہیں، اردو کی تعلیمی حالت کو سدھار نہیں سکیں۔ جیسا کہ پروفیسر اسیس دتا کا خیال ہے:

"شمالی ہند میں اردو کی تعلیم نہ صرف یہ کہ پرائمری سطح پر نہیں ہو رہی ہے بلکہ اسے اختیاری زبان کی حیثیت سے بھی نہیں پڑھایا جا رہا۔ شمالی ہند جو اردو کا روایتی گڑھ ہے۔"(5)

پروفیسر دتا نے اردو کی اہمیت پر ایک قومی طرز کی زبان کی حیثیت سے زور دیا جس کی اہمیت زمانہ حال کے بحرانوں کے تناظر میں اور بڑھ گئی ہے اور مقامی اور عالمی سطح پر اس نے نئی نئی سمتوں کو جنم دیا ہے جن کو تسلیم کرنے کی ضرورت ہے۔

اور آخری بات یہ ہے کہ اگر ہندستان اپنی دانش، علم، مہارت اور لسانیاتی صلاحیتوں کا استعمال کرے تو عالمی سطح پر وہ بہت بڑا کردار ادا کرسکتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم ایسا لائحۂ عمل تیار کریں جس میں گہری سوچ کا دخل ہو تاکہ شمولیت اور اتحاد کو فروغ دینے والی پالیسیاں اور لائحۂ عمل وضع کرسکیں جو جمہوریت کے سیاق میں ایک سیاسی نظام میں مختلف قسم کے عناصر کے ساتھ تال میل پیدا کرسکتی ہوں۔ اس کے برعکس اگر علاحدگی کی پالیسیاں اور کارکردگیاں جاری رہیں تو ان کا نتیجہ تصادمات ہوسکتا ہے جس سے اتحاد کی طاقت کو نقصان پہنچے گا اور جس کا راستہ واپس پس ماندگی کی طرف جائے گا۔

حواشی:

1- The Economist, London 22 December 2001.
2- Godbole, M. "Elementary Education as a Fundamental Right", Econimic and Political Weekly, 15.12.2001.
3 -The Indian Express, Vadodra (Baroda), 31.1.1999.
4- Economic and Political Weekly, March 6-13.1999.
5- Asia Datta, Agenda for Urdu Education in the 21st Century, India with special Reference to Dr. Zakir Husain, 3rd May, 1998, p.3.

(بشکریہ "اردو ادب" دہلی، جولائی۔ ستمبر 2004)

□□□

سائنس کی کہانیاں (حصہ اول)

مصنف: سکلف اور سکلف / مترجم: ڈاکٹر انیس الدین ملک

سائنس ہماری زندگی کا لازمی جزو ہے۔ اس کے بغیر موجودہ زندگی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ زیر نظر کتاب میں کہانیوں کی مدد سے مختلف اشیا کی اہمیت اجاگر کی گئی ہے اور ان سے متعلق تمام جانکاری بھی دی گئی ہے۔

صفحات: 152، قیمت: 18 روپے

عرب کی لوک کہانیاں: ایک تہذیبی ورثہ

مصنف: ڈاکٹر حسن عسکری کاظمی

کسی بھی ملک اور معاشرے میں لوک ادب کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اس کے ذریعے ہم براہ راست اس ملک اور معاشرے کی تہذیب و ثقافت، رہن سہن، طور طریق، عادات، اطوار اور عقائد وغیرہ سے واقف ہوتے ہیں۔ لوک ادب ادبی تصنع، فنی قیود اور پابندیوں سے پاک ہوتا ہے۔ اس لیے یہ عوام سے نزدیک ہوتا ہے۔ اس کتاب میں 28 لوک کہانیاں شامل ہیں جو عوامی لوک ادب کے ہر رنگ کی نمائندگی کرتی ہیں۔

صفحات: 131، قیمت: 23/- روپے

نورتن کہانیاں

مصنف: محمد بخش مہجور / انتخاب: شمیم احمد

محمد بخش مہجور کی کتاب "نورتن" قدیم ادب میں اہم مقام کی حامل ہے۔ نو ابواب پر مشتمل اس کتاب میں دلچسپ انداز میں سبق آموز کہانیاں پیش کی گئی ہیں۔ زیر نظر انتخاب میں بچوں کی ذہنی صلاحیت کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کہانیوں کی زبان سہل اور عام فہم بنا دی گئی ہے تاکہ بچے انہیں بخوبی پڑھنے اور سمجھنے کے ساتھ ساتھ لطف اندوز بھی ہوسکیں۔

صفحات: 192، قیمت: 20/- روپے

ایک نائی اور ٹھگ سردار کا قصہ

مصنف: اطہر پرویز

داستانیں ہمارا قیمتی سرمایہ ہیں۔ یہ جہاں ایک طرف تفریح طبع کا ذریعہ ہیں وہیں ان سے متعلقہ عہد کی جیتی جاگتی تصویر بھی ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ ہوش و خرد کی فطری عناصر کی شمولیت سے قطع نظر داستانوں میں ہماری سماجی و ثقافتی تاریخ پوشیدہ ہے۔ اس کتاب میں ایسی ہی تین داستانیں شامل ہیں۔

صفحات: 148، قیمت: 18/- روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

سید سلیمان اختر

اردو اور ہندستانی فلمیں

اردو اور ہندستانی فلموں کا تعلق ابتدا ہی سے ہے۔ بلاشبہ آج بھی اردو اور فلموں کے مراسم مزید بہتر ہونے کے باعث فلم سازی کا عمل اردو کی شیرینی اور حلاوت کے ساتھ پروان چڑھ رہا ہے۔

فلم اور ہندستان کی تاریخ پر نظر رکھنے والے ایک طبقے کا خیال ہے کہ اگر کسی ایک چیز نے اردو کو زندہ رکھا ہے تو وہ فلمیں ہیں۔ فلم کی حیثیت ایک فن پارے کی سی ہے۔ جس طرح ایک فن پارہ اپنی تخلیق کے بعد عوام کی توجہ کا مرکز بنتا ہے، بے شمار لوگ اس سے استفادہ کرتے ہیں اور وہ چیز آئندہ نسلوں کو منتقل ہوتی رہتی ہے۔ اسی طرح ایک اچھی فلم کی یاد ہمیشہ اذہان میں باقی رہتی ہے۔ لوگ بار بار اچھی فلموں کو دیکھنا چاہتے ہیں، ان کے نغمات سن کر لطف اندوز ہوتے ہیں اور مکالمے دہرا کر محظوظ ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر 'مغلِ اعظم' اپنی تخلیق کی چار دہائیوں اور 'شعلے' تین دہائیوں کے بعد بھی مقبول ہے۔ 'مغلِ اعظم' کے کردار، مکالمے، نغمات اور اس میں پرتھوی راج کپور، دلیپ کمار اور مدھو بالا کی اداکاری میں عوام کی دلچسپی آج بھی برقرار ہے۔ 'مغلِ اعظم' میں فارسی زدہ اردو کے استعمال کے باوجود اس کے نغمات اور مکالمے انتہائی مقبول ہیں۔ اور کلی طور پر رنگین 'مغلِ اعظم' نے تو کئی نئی فلموں سے سبقت حاصل کر لی ہے۔ 'شعلے' کو تو گذشتہ الفیے کی فلم قرار دیا ہی جا چکا ہے۔

فلموں میں اردو کا استعمال ان کے ناموں سے لے کر منظر ناموں اور نغمات تک جابجا دیکھا جا سکتا ہے۔ خواہ ہندی کو بھارت کی سرکاری زبان قرار دے دیا گیا ہو، تاہم عوام ہندستانی میں ہی بات کرتے ہیں جس میں اکثریت اردو الفاظ کی ہوتی ہے۔ اور اب چوں کہ تلفظ کی صحیح ادائیگی کی جانب بھی بیدار مغزی پائی جانے لگی ہے اس لیے بول چال میں بھی اس کا خیال رکھا جاتا ہے۔

برقی ذرائع ابلاغ کے نشریوں میں جو زبان استعمال ہوتی ہے وہ اردو سے زیادہ قریب ہے (دوردرشن اور آل انڈیا ریڈیو کی زبان کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا جا سکتا ہے کیوں کہ خالص ہندی استعمال کرنا ان کی مجبوری ہے مگر اس کے باوجود ان کی نشریات میں بھی اردو الفاظ موجود ہوتے ہیں)۔ نجی ٹی وی چینلوں اور نجی ریڈیو اسٹیشنوں پر استعمال کی جانے والی زبان بلا مبالغہ خالصتاً اردو نہیں تو اردو سے قریب تو ہوتی ہی ہے۔ یہ فلموں میں استعمال ہونے والی زبان ہی کا اثر ہے کہ فلموں کی زبان کی عوامی مقبولیت نے دیگر برقی ذرائع ابلاغ کو بھی اسی طرح کی عوام پسند زبان کو اپنی نشریات میں ترجیح دینے پر مجبور کیا۔

سینما کے پوسٹروں نے بھی اردو رسم الخط کی بقا کو ضمانت فراہم کی۔ فلموں کے ٹائٹل نے اردو رسم الخط کی شناسائی کو یقینی بنایا۔ آج بھی حالاں کہ بالعموم فلمی پوسٹروں پر فلموں کے نام اردو میں نہیں دیے جاتے، یہی حال اب فلمی ٹائٹل کا بھی ہو رہا ہے مگر عرصہ دراز کے بعد 2004 میں ریلیز کی گئی فلم 'مقبول' اور 'خاموش پانی' کے پوسٹروں پر فلم کے ٹائٹل اردو میں بھی نظر آئے۔ 2003 کی کامیاب فلموں میں فلم 'باغبان' اور 2004 کی ایک انتہائی کامیاب فلم 'میں ہوں نا' کا ٹائٹل اردو میں بھی دیا گیا تھا۔

فلموں کے پوسٹروں پر فلموں کے نام کا اردو میں بھی لکھا ہونا اور فلموں میں ٹائٹل کا ہندی اور انگریزی کے علاوہ اردو میں بھی ہونا آج ایک غیر اہم سی چیز معلوم ہو سکتا ہے مگر تقسیمِ ہند اور اردو کو پاکستان کی سرکاری زبان تسلیم کر لیے جانے کے بعد جب کہ مسلمانوں اور اردو کے خلاف محاذ آرائی کی فضا عام تھی ایسے وقت میں فلموں کے پوسٹروں اور ٹائٹلوں کے ذریعے بھی اردو رسم الخط کا تحفظ قابلِ ذکر امر ہے۔

وطنِ عزیز کی محبت میں اردو کے شعراء نے بہت کچھ لکھا مگر وہ چیزیں ایک قابلِ لحاظ خواندہ طبقے کی نظر سے گزریں اور اس سے بھی کم لوگوں کی یادداشت میں باقی ہیں۔ مگر حب الوطنی کو موضوع بنا کر لکھے گئے گیتوں کو فلموں ہی نے تحفظ دیا۔ جب بھی حب الوطنی کے نغمات کی بات کی جاتی ہے تو بے اختیار یادوں کے نہاں خانوں سے نکل کر مندرجہ ذیل نغمات ہونٹوں پہ بکھر جاتے ہیں:

کر چلے ہم فدا جان و تن ساتھیوں
اب تمہارے حوالے وطن ساتھیوں
اے وطن اے وطن ہم کو تیری قسم
تیری راہوں میں جاں تک لٹا جائیں گے

نغمات جس طرح ہندستانی فلموں کا جزو لاینفک ہیں اسی طرح عشق و محبت فلموں کا لازمی حصہ ہیں اور ہندستانی فلموں میں پیار و محبت کے اظہار کے لیے سب سے موثر حربہ نغمات ہی ہیں۔ حدیثِ دل کی تشریح کے لیے جس قدر موزوں الفاظ کا خزانہ اردو ادب میں موجود ہے وہ اپنے آپ میں بے نظیر ہے۔ خالص ہندی زبان میں بھی اظہارِ عشق کی کوشش تو کی گئی ہے مگر

وہ خال خال ہی ہے اور بے تکی بھی۔ ایک نغمے کے بول ملاحظہ کریں، حقیقت واضح ہو جائے گی:

''پدی آپ ہمیں آدیش کریں تو
پریم کا ہم شری گنیش کریں
اک چتر نار کر کے سنگار ہمرے من کے دوار
یہ گھست جات، ہم مرت جات''

اس سے قطع نظر انھیں احساسات کو اگر بعض اردو الفاظ کی مدد سے نثر میں بھی کہیں تو سماعت پر گراں نہیں گزرتا اور متذکرہ ٹکڑوں کے مقابلے تو نسبتاً بہتر ہی معلوم ہوں گے۔ جیسے اگر یوں کہیں کہ اگر آپ ناپسند نہ کریں تو حالِ دل بیان کروں، تو بات کم و بیش وہی ہوئی جو پہلے نغمے کے بول میں کہی گئی مگر اردو کے کچھ لفظوں کے استعمال سے اندازِ بیان مزید بہتر ہو گیا اور اردو ہی وہ زبان ہے جس میں فلموں میں دو محبت کرنے والے دل ایک دوسرے کے لیے اپنی محبت کا برملا اظہار کرتے ہیں۔

ذرا رخ پہ بکھری یہ زلفیں ہٹا دو
گھٹاؤں کے دامن پہ بجلی گرادو
نظر کہہ رہی ہے سلامِ محبت
دھڑکتا ہے دل سن کے نامِ محبت
ہم تو اک دوسرے پہ مرتے ہیں
جانتا یہ جہان سارا ہے

یہ اظہار محبت کرنے والے نغمات ہیں۔ اگر دل کی جگہ ہردے، خبر کی جگہ سماچار، حسیں کی جگہ سندر، کس قدر کی جگہ کتنی تمنا کی جگہ اِچھا، عمر کی جگہ آیو، صورت کی جگہ مکھ، نظر کی جگہ درشٹی، رشتہ کی جگہ سمبندھ اور جہان کی جگہ وشو کا استعمال کیا جاتا تو ان نغموں کی کیا درگت بنتی۔ خالص ہندی زبان میں وہ بات آ ہی نہیں پاتی جو نغمے کے بولوں کی تشکیل کے لیے اردو کے استعمال سے پیدا ہوتی ہے۔ اور ایسی مثالیں ایک دو نہیں ہزاروں ہیں۔

اردو شاعری نے فلموں میں تین صورتوں میں جگہ پائی۔

اول، کلاسیکی اردو شاعری کو فلمی ضرورتوں کے اعتبار سے من و عن فلموں میں استعمال کیا گیا۔ مثال کے طور پر:

امیر خسرو کا گیت 'کاہے کو بیاہے بدیس' فلم 'امراؤ جان' میں استعمال ہوئی ہے۔ مغل تاجدار اور شاعر بہادر شاہ ظفر کا کلام 'لگتا نہیں ہے جی مرا اجڑے دیار میں' فلم 'لال قلعہ' میں استعمال کیا گیا۔ 'شمشیر برہنہ' بھی بہادر شاہ ظفر کا ہی کلام ہے جسے فلم 'منڈی' میں شامل کیا گیا ہے۔ یہ فلم 1983ء میں نمائش کے لیے پیش ہوئی تھی اور ظفر کے کلام کو آواز سے پریتی ساگر نے آراستہ کیا تھا۔

حسرت موہانی کی غزل 'چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے' فلم 'نکاح' میں استعمال ہوئی۔ غلام علی نے اس غزل کو اپنی آواز دے کر اس کے مداحوں کے حلقے کو بہت وسیع کیا۔ میر تقی میر کا کلام 'دکھائی دیئے یوں کہ بے خود کیا' کو فلم 'بازار' میں بطور نغمہ استعمال کیا گیا۔ مرزا غالب کی غزل 'دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے' فلم 'مرزا غالب' میں استعمال کی گئی۔ علامہ اقبال کا کلام 'کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں' فلم 'دلہن اک رات کی' میں شامل ہوا۔ قلی قطب شاہ کا کلام 'پیا باج پیالہ پیا جائے نا' فلم 'نشانت' کی زینت بنا۔ واجد علی شاہ کا کلام 'بابل مورا نئی ہر چھوٹا جائے' فلم 'استری سنگار' میں لیا گیا۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ فلم 'سوراج' میں میر انیس اور جمیل مظہری کے مرثیے شامل کیے گئے ہیں۔ ہدایت کار انور جمال کی یہ فلم 2002 میں نمائش کے لیے پیش ہوئی اور 2003 میں اسے بہترین فیچر فلم برائے سماجی مسائل کا قومی اعزاز بھی دیا گیا۔

دوم، اردو شعرا نے اپنے شائع شدہ کلام کو فلموں میں شامل کیا۔ مثالیں ملاحظہ کیجیے:

ساحر لدھیانوی فلموں کے لیے لکھنے سے پیشتر بھی معروف ترقی پسند شاعر تھے۔ جاں نثار اختر، کیفی اعظمی، مجروح سلطانپوری اور ندا فاضلی بھی اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ساحر کو جب نغمہ نگار کے طور پر کامیابی مل گئی تو انھوں نے اپنی بعض مشہور شعری تخلیقات کو فلموں میں بطور نغمہ پیش کیا۔ ان کے شعری مجموعوں 'تلخیاں' اور 'آؤ کہ کوئی خواب بنیں' کی بعض نظمیں فلموں میں بطور نغمہ شامل ہوئیں۔ 'تلخیاں' کی نظم 'متاعِ غیر' (فلم سونے کی چڑیا میں)، نظم 'چکلے' (فلم پیاسا میں)، اور نظم 'خوبصورت موڑ' (فلم گمراہ میں)، بطور نغمہ شامل ہو چکی ہیں۔ اس کے علاوہ 'آؤ کہ کوئی خواب بنیں' کی نظم 'کبھی کبھی' فلم 'کبھی کبھی' میں امیتابھ بچن کی آواز میں گائی گئی۔ ساحر کے علاوہ جاوید اختر نے اپنے پہلے اور واحد مجموعہ کلام 'ترکش' سے ایک نظم کو فلم 'Duplicate' میں شامل کیا۔

نظم تھی 'کتنی آنکھوں والی اک لڑکی ایک ہی بات پہ روز جھگڑتی ہے، تم مجھے کیوں نہیں ملے پہلے روز یہ کہہ کر مجھ سے لڑتی ہے'۔ اس کے علاوہ اور بھی مثالیں ہیں۔ مخدوم محی الدین کی نظم 'چارہ گر' فلم 'چا چا' میں بطور نغمہ شامل ہو کر مقبول ہوئی۔ 'اک چمیلی کے منڈوے تلے' مخدوم کی غیر فلمی تخلیق ہے جسے بعد میں فلم میں بطور نغمہ پیش کیا گیا۔ مخدوم کا ہی کلام 'پھر چھڑی رات بات پھولوں کی' فلم 'بازار' میں شامل ہے۔ فیض احمد فیض کا کلام 'مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ' فلم 'قیدی' میں بطور نغمہ شامل ہے۔ اسرار الحق مجاز کی نظم 'آوارہ' کو فلم 'ٹھوکر' میں لیا گیا۔ جاں نثار اختر کا کلام 'آئی زنجیر کی جھنکار خدا

خیر کرے' فلم 'رضیہ سلطانہ' میں شامل ہے۔ کیفی اعظمی کا کلام 'ہو کے مجبور مجھے اس نے بھلایا ہوگا' فلم 'حقیقت' میں بطور نغمہ پیش کیا گیا۔ مجروح سلطانپوری کا کلام 'ہم ہیں متاع کوچہ و بازار کی طرح' فلم 'دستک' میں بطور نغمہ شامل ہے۔ سردار جعفری کا کلام 'شام غم کی قسم' فلم 'فٹ پاتھ' میں شامل ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ معروف اردو شعرا کے کلام کو عوام کے بڑے طبقے تک پہنچانے، انھیں عمر جاودانی عطا کرنے اور ان کے تحفظ کو یقینی بنانے میں فلمیں کس حد تک مددگار ثابت ہوئی ہیں۔

سوم، معروف اردو شعرا کے کلام سے مصرعے، ٹکڑے اور شعرا کے حوالے جابجا ہندستانی فلمی نغموں میں جگہ پا گئے ہیں۔

مثال کے طور پر:

فلم 'اک دوجے کے لیے' کے نغمے 'ہم بنے تم بنے اک دوجے کے لیے' میں نغمے کے بیچ میں مغنیہ گاتی ہے 'عشق پر زور نہیں، غالب نے کہا ہے اسی طرح۔ مومن کا یہ جاوداں شعر:

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

فلم 'لو ان شملا' کے نغمے 'اے مرے شاہ خوباں اے مری جان جاناناں تم مرے پاس ہوتے ہو کوئی دوسرا نہیں ہوتا' کی شکل میں استعمال ہوا ہے۔ غالب کا مصرعہ 'جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن' فلم 'موسم' میں نغمے کی صورت میں یوں ڈھلا ہے:

دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصور جاناں کیے ہوئے

فلم 'دل سے' کے نغمے 'تو ہی تو ہی تو ست رنگی رے' کے بیچ میں غالب کا یہ شعر استعمال ہوا ہے۔

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
جو لگائے نا لگے اور بجھائے نا بنے

اردو غزل اپنی ہیئت اور موضوعات کے ساتھ فلمی شاعری کا قلب و جان بن گئی ہے۔ فلمی نغموں نے اردو شاعری کی جس صنف سے زیادہ استفادہ کیا وہ اردو غزل ہے، اور یہ فیض یابی صرف ہیئت تک ہی محدود نہیں بلکہ موضوعات تک ہے۔

غزل نے فلمی شاعری میں تین اعتبار سے اپنی جگہ محفوظ کی۔ اول تو یہ کہ غزل کو بطور نغمہ فلموں میں پیش کیا گیا۔ اس کے بعد معروف اردو شعرا (غالب، میر، اقبال، فیض وغیرہ) کی غزلیں فلموں میں شامل کی گئیں۔ اور ان چیزوں کا دیرپا اثر یہ ہوا کہ عام طور پر فلمی نغموں کے مکھڑے ردیف اور قافیہ کے التزام کے ساتھ غزل کا مطلع معلوم ہونے لگے۔ بقیہ چیزیں تو وقت کے ساتھ ساتھ کم ہو گئیں مگر جہاں تک نغموں کے مکھڑے کا غزل کے مطلع سے مشابہ ہونا ہے، ہنوز باقی ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:

آج کہنا ضروری ہے کہ تم سے پیار ہوا ہے
بڑی مشکل یہ دوری ہے کہ تم سے پیار ہوا ہے
(فلم: انداز، نغمہ نگار: سمیر، 2003)

تیرے نام ہم نے کیا ہے جیون اپنا سارا صنم
پیار بہت کرتے ہیں تم سے عشق ہے تو ہمارا صنم
(فلم: تیرے نام، نغمہ نگار: سمیر، 2003)

تیری باہوں میں ہم جیتے مرتے رہے
یوں ہی ہم تم سے پیار کرتے رہے
(فلم: خاکی، نغمہ نگار: سمیر 2004)

متذکرہ مثالیں تو حال کی ہی ہیں۔ غزل سے استفادے کی یہ روایت دہائیوں پرانی ہے۔ ذیل میں کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں:

محبت کی جھوٹی کہانی پہ روئے
بڑی چوٹ کھائی جوانی پہ روئے
(فلم: مغل اعظم، نغمہ نگار: شکیل بدایونی)

رخ سے ذرا نقاب اٹھا دو مرے حضور
جلوہ پھر ایک بار دکھا دو مرے حضور
(فلم مرے حضور، نغمہ نگار: حسرت جے پوری)

دل کے ارماں آنسوؤں میں بہہ گئے
ہم وفا کر کے بھی تنہا رہ گئے
(فلم: نکاح، نغمہ نگار: حسن کمال)

دھڑکنیں، سانسیں، جوانی، زندگانی آپ کی
آپ نے چاہا ہمیں یہ مہربانی آپ کی
(فلم: بیٹا، نغمہ نگار: سمیر)

مزید وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں کہ اردو غزل نے ہندستانی فلمی نغموں پر کیسی انمٹ چھاپ چھوڑی ہے یہی وجہ ہے کہ فلمی نغموں کے ابتدائی بول غزل کا مطلع معلوم ہونے لگے ہیں۔ مزید برآں اردو غزل نے بطور نغمہ فلموں میں جگہ پائی ہے۔ ذیل میں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

ہم ہیں متاع کوچہ و بازار کی طرح
اٹھتی ہے ہر نگاہ خریدار کی طرح
(فلم: دستک، شاعر: مجروح سلطان پوری)

تم کو دیکھا تو یہ خیال آیا
زندگی دھوپ تم گھنا سایا

(فلم: ساتھ ساتھ،شاعر جاوید اختر)

ان آنکھوں کی مستی کے مستانے ہزاروں ہیں
ان آنکھوں سے وابستہ افسانے ہزاروں ہیں

(فلم: امراؤ جان، شاعر: شہریار)

ہوش والوں کو خبر کیا بے خودی کیا چیز ہے
عشق کیجیے پھر سمجھئے زندگی کیا چیز ہے

(فلم: سرفروش، شاعر: ندا فاضلی)

جاگتے جاگتے اک عمر کٹی ہو جیسے
جان باقی ہے مگر سانس رکی ہو جیسے

(فلم: تم بن، شاعر: فیاض انور)

بلا شبہ اردو شاعری کی مقبول صنف غزل ہندستانی فلموں کا جزو لاینفک بن گئی اور غزل اپنی ہیئت اور موضوعات کے ساتھ فلمی دنیا کا لازوال حصہ بن گئی، یہی وجہ ہے کہ آج غزل سرائی باقاعدہ پیشہ بن گئی۔ اس پیشے سے وابستہ بعض معروف ناموں میں: جگجیت سنگھ، پنکج ادھاس، طلعت عزیز اور چندن داس وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

ہندستانی فلموں سے اردو شاعروں کی باقاعدہ وابستگی سے ان شعراء کو فکر معاش سے آزادی ملی جس سے ان کے تخلیقی سوتے خشک نہیں ہوئے۔ شکیل بدایونی، ساحر لدھیانوی، مجروح سلطانپوری، جاں نثار اختر اور جاوید اختر ایسے اردو شعرا ہیں جنھوں نے فلمی شاعری کو نئی وسعتوں سے روشناس کرایا اور اردو کی شعری آفاقیت سے نغمات کے دامن کو پُر کر کے اسے ادبی شاعری کے ہم پلہ بنانے کی کوشش کی۔ اگر 50 اور 60 کی دہائیوں کی فلموں کو ہندستانی فلموں کا سنہرا دور کہا جاتا ہے تو اس میں متذکرہ اردو شعرا کی خدمات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

کسی زبان کے ساتھ اس کی لفظیات اور تلفظ کا معاملہ بڑا اہم ہوتا ہے۔ اردو کے ساتھ اس کی خصوصی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ اردو کے بہت سارے الفاظ بگڑی ہوئی شکل میں ہندی زبان میں کثرت سے مروّج ہیں۔ ایسی حالت میں عوام کو تذبذب کی کیفیت سے بچانے کے لیے یہ بڑا ضروری ہے کہ الفاظ کی ادائگی مناسب ہو۔

ایک زمانے میں الفاظ کا صحیح تلفظ سیکھنے کے لیے اساتذہ دوردرشن اور آل انڈیا ریڈیو کے خبرناموں کو توجہ کے ساتھ سننے کی تلقین کیا کرتے تھے۔ ایسا اس لیے تھا کہ اس زمانے میں زبان کی صحت پر بڑا زور دیا جاتا تھا اور خبروں کو پڑھنے کے لیے تلفظ کی ادائگی لازمی ہوا کرتی تھی۔ اب ٹیلی ویژن کے اردو اور ہندی خبرناموں کی زبان بھی مخلوط ہو گئی ہے کیوں کہ عوام میں اسی قسم کی زبان رائج ہو رہی ہے۔

مذکورہ صورت حال میں ہندستانی فلموں نے نغموں اور مکالموں میں اردو زبان کے تلفظ کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ آج اردو زبان کو سیکھنے کے لیے فلمی نغمے حوالے کے طور پر استعمال کیے جاسکتے ہیں۔ اگر یہ دیکھنا ہو کہ کوئی لفظ کیسے بولا جاتا ہے، کسی لفظ کا صحیح تلفظ کیا ہے تو فلموں میں (بالخصوص نغموں میں) اس لفظ کے استعمال کو دیکھنے سے اس کا علم ہوتا ہے کہ کوئی مخصوص لفظ کس سیاق میں کیسے استعمال ہوتا ہے اور اس کا درست تلفظ کیا ہے۔ سماج کے دوسرے اداروں کی طرح فلموں میں بھی انحطاط ہوا ہے مگر اس کے باوجود فلموں میں آج بھی بڑی حد تک اس کا خیال رکھا جاتا ہے، جو اردو زبان کی مقبولیت کا ضامن ہے۔

ہندی فلموں میں عدالت کے مناظر خاصے مقبول ہوتے ہیں۔ ان کی بدولت کئی فلمیں کامیابی سے ہم کنار ہوئیں۔ عدالت میں منصف بالکل انگریز معلوم ہوتا ہے، وکلاء بھی اسی قبیل کے معلوم ہوتے ہیں۔ سارے ماحول سے برطانوی حکومت کے ہنوز باقی رہنے کا گمان گزرتا ہے۔ مگر اس کے باوجود جو زبان استعمال ہوتی ہے وہ اردو ہے۔ عدالت کی کاروائی دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو یہاں سر چڑھ کر بولتی ہے۔ ملزم، مجرم، ثبوت، چشم دید گواہ، قتل، وکیل، انصاف، معصوم، گناہ گار، بیان جیسے الفاظ دہائیوں سے عدالتی زبان کا حصہ ہیں۔ پھر منصف جب اپنا فیصلہ سناتا ہے تو کہتا ہے.... دفعہ نمبر، تعزیرات ہند دفعہ .... کے تحت، اور پھر سزا، عمر قید یا سزائے موت۔ اور اگر ملزم بے قصور ہے تو باعزت بری ہو جاتا ہے۔ یعنی فلموں میں عدالتی مناظر کی عکس بندی کے لیے جو زبان استعمال ہوتی آئی ہے وہ اردو ہے۔ اور عدالت میں جرح، دلیل، شواہد، مباحث اور فیصلوں سے متعلق لفظیات اردو کے ہی خزانے سے مستعار لی جاتی رہی ہیں۔ اس طرح سات دہائیوں سے بھی زیادہ عرصے پر محیط بولتی فلموں کی تاریخ میں عدالت کے مناظر میں استعمال ہونے کی وجہ سے متذکرہ لفظیات محفوظ ہو گئی ہیں۔ یہاں ایک اہم چیز کی جانب اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بی آر چوپڑا کی فلم 'قانون' ایسی پہلی فلم ہے جس کا بیشتر حصہ عدالتی مناظر پر مبنی ہے اور اس فلم کی کامیابی نے فلموں میں عدالتی مناظر رکھے جانے کی راہ ہموار کی۔ عدالتی مناظر والی دیگر فلموں میں 'وقت' اور 'میرا سایہ' بھی ہیں۔ ان فلموں میں قدر مشترک یہ ہے کہ ان کی کہانیاں اور منظرنامے معروف ادیب اختر الایمان نے تحریر کیے تھے۔

اردو صرف عدلیہ اور انتظامیہ ہی کی نہیں بلکہ عوام کی بھی زبان

ہے۔ ہندستانی فلمیں عوام کے ایک بڑے طبقے کی تفریح کا واحد اور سستا ذریعہ ہیں۔ تکنیکی انقلاب کی وجہ سے فلموں کے تحفظ کے ساتھ فلموں میں استعمال ہونے والی زبان کا تحفظ بھی یقینی ہو گیا۔

لوگ اردو اس لیے پڑھنا نہیں چاہتے کہ اردو روزگار سے جڑی ہوئی نہیں ہے۔ اس لیے ایسی زبان پڑھنے سے فائدہ کیا جس سے کوئی مالی منفعت حاصل نہ ہو۔ جو لوگ شاعری کا ذوق رکھتے ہیں وہ مشکل الفاظ کے معنی کسی سے پوچھ کر شاعری سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ کئی ریاستوں میں اردو ابتدائی جماعتوں سے ہٹا دی گئی ہے جس کی وجہ سے اردو رسم الخط سے بے گانگی پیدا ہو گئی ہے۔ ایسی صورت میں فلموں سے اردو کو بڑا تحفظ مل رہا ہے۔

اس موقعے پر ذہن میں اس سوال کا اٹھنا بھی لازمی ہے کہ آخر اردو ہی فلموں کی زبان کیوں قرار پائی۔ ہندی فلموں کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اس کی جڑیں پارسی تھیٹر میں ہیں جس کی زبان اردو تھی۔ فلموں کے آنے سے تھیٹر سے وابستہ لوگ رفتہ رفتہ فلم سازی کی طرف مائل ہوئے اور اپنے ساتھ اس زبان کو بھی لائے جو اس وقت کے عوام کی بول چال کی زبان تھی یا یوں کہیں کہ اردو ہی وہ زبان تھی جس میں شہری اور متوسط طبقہ آپس میں بات کرتا تھا اور اس طبقے کے بڑے حصے تک رسائی کے لیے پہلے تھیٹر میں یہ زبان استعمال کی گئی بعد ازاں وہاں کی کامیابی کے مد نظر فلموں میں بھی زبان شامل ہونے لگی۔

برطانوی حکومت میں اردو شمالی ہند میں انتظامیہ کی زبان بنی۔ پہلے یہی مقام فارسی زبان کو حاصل تھا۔ فوج، عدلیہ اور انتظامیہ کی زبان اردو تھی۔ انتظامی زبان ہونے کی وجہ سے سرکاری کام کاج اسی زبان میں ہونے لگے اور عوام تک سرکاری فیصلے اسی زبان میں پہنچنے لگے۔ جب عیسائی مبلغ یہاں آئے تو انھوں نے سب سے پہلے بائبل کا ترجمہ اردو زبان میں کیا۔ ہندی میں بائبل بہت بعد میں آئی۔ عوام میں بول چال کی زبان کے طور پر اردو کے ابھرنے کے چند اسباب تھے۔ سنیما بھلا عوام تک رسائی کے لیے ان سے کیسے پہلو تہی کر سکتا تھا۔ اسی لیے سنیما نے بھی اسی زبان کو اپنایا۔

فلموں نے اردو زبان و ادب کے ساتھ ساتھ اردو تہذیب کو تحفظ عطا کرنے میں بھی نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ فلمیں ایسا تاریخی دستاویز ہیں جن کے مطالعے اور تجزیے سے مختلف ادوار میں اردو کی حیثیت کا پتہ چل سکتا ہے۔ اردو زبان و ادب پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے بھی فلمیں اچھا مواد ہیں۔

□□□

R-76, Jogabai Extension, Jamia Nagar, New Delhi

دھوپ چولھا

مصنف: ایم۔ ایم۔ بھٹی / مترجم: ڈاکٹر خلیل اللہ خاں

توانائی کے بحران نے قدرتی وسائل کی طرف پھر سے انسان کی توجہ مرکوز کی ہے۔ دھوپ چولھا یا سولر کوکر کی ایجاد اس کی تازہ مثال ہے۔ اس کتاب میں دھوپ چولھا تیار کرنے کے سلسلے میں کیے گئے مختلف تجربات اور ان کے نتائج کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ کتاب میں دھوپ چولھا بنانے کا طریقہ اور کوکر میں مختلف کھانے پکانے کی ترکیبیں بھی بتائی گئی ہیں۔

صفحات: 100، قیمت: -/38 روپے

کیمیا کی کہانی

مصنف: سید شہاب الدین دسنوی

انسان فطری طور پر تجسس پسند واقع ہوا ہے۔ کیا، کیوں اور کیسے وغیرہ سوالات انسان کے ذہن میں ہمیشہ کوندتے رہے ہیں اور یہی سوالات مختلف ایجادات و انکشافات کا پیش خیمہ ثابت ہوتے ہیں۔ "کیمیا کی کہانی" میں بعض اہم عناصر مثلاً آکسیجن، بجلی، سوڈا، کیلشیم، میگنیشیم اور ریڈیم وغیرہ کی دریافت کے بارے میں بتایا گیا ہے۔

صفحات: 128، قیمت: -/16 روپے

اَسّی دن میں دنیا کا سفر

مصنف: جولس ورن / مترجم: صفدر حسین

ایک بے حد دلچسپ ناول جس میں ایک اصول پسند اور اولوالعزم آدمی کی کہانی بیان کی گئی ہے جس نے اپنے دوستوں کے ساتھ شرط لگائی تھی کہ وہ اسی دن میں پوری دنیا کا سفر طے کرے گا۔ 20 ہزار پونڈ کی اس شرط کو جیتنے کے لیے اس نے اس سے کہیں زیادہ رقم خرچ کر دی۔ لیکن کیا وہ شرط جیت سکا؟ یہ جاننے کے لیے کتاب کا مطالعہ کریں۔

صفحات: 170، قیمت: -/21 روپے

حیوانات کی دلچسپ دنیا

مصنف: محمد خلیل

حیوانات ہماری رنگ برنگی دنیا کے حسن و دلفریبی میں اضافہ بھی کرتے ہیں اور ماحولیاتی توازن برقرار رکھنے میں بھی معاون ہیں۔ زیر نظر کتاب میں بڑے دلچسپ انداز میں مختلف قسم کے حیوانات مثلاً ڈائنوسور، ہرن، بلی، ہاتھی، زرافہ، جگنو، شیر اور چیتا وغیرہ سے متعلق تفصیلات درج ہیں۔ ایک بے حد دلچسپ کتاب جس کو بچوں کے ساتھ بڑے بھی پسند کریں گے۔

صفحات: 111، قیمت: -/17 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

تحریر: ڈیجو زاونے
ترجمہ: فضیل احمد خاں

جیکس دریدا

فرانس کے مشہور فلسفی جیکس دریدا کا گذشتہ 19 راکتوبر کو انتقال ہوگیا۔ وہ 74 برس کے تھے۔ جیکس دریدا 1960 کی دہائی کے ممتاز ترین فلسفیوں کے سلسلے کی آخری کڑی تھے۔ ان کے اہم ترین فلسفی معاصرین میں لوئس التھسر (Louis Althusser)، جیکس لیکن (Jacques Lacan)، جاں پال سارتر (Jean-Paul Sartre)، رولاں بارتھ (Roland Barthes)، گیلیس ڈیلیوز (Gilles Deuluze)، مائیکل فوکو (Michael Foucault) اور پیرے بورڈیو (Pirre Bourdieu) قابلِ ذکر ہیں۔ جیکس دریدا کے انتقال سے فرانس کے دانشور طبقے کو گہرا صدمہ پہنچا ہے۔

پچھلے کچھ برسوں سے دریدا معدے کے کینسر سے دوچار تھے۔ تین ہفتے پہلے انھیں پیرسین اسپتال میں آنتوں کے آپریشن کے لیے داخل کیا گیا تھا۔ لیکن قریبی ذرائع کا کہنا ہے کہ فلسفی دریدا کی فوری موت کی وجہ دماغ سے خون کا بہنا ہے۔

دریدا ہمارے زمانے کے بے حد اہم فلسفیوں میں سے ایک تھے۔ ان کے چاہنے والوں اور ان کے نکتہ چینوں کی تعداد تقریباً یکساں تھی۔ دریدا کا علمی کارنامہ اب تک تقریباً ایک ہزار تحقیقی مقالوں کا موضوع رہا ہے۔ صرف فلسفہ اور ادبی تنقید کے لیے پچھلے پندرہ برسوں میں دریدا کو 1400 بار سے زیادہ علمی رسالوں میں یاد کیا گیا ہے۔

دریدا کا عظیم فلسفیانہ کام ویسے تو 80 سے زیادہ کتابوں پر پھیلا ہوا ہے، لیکن وہ سب سے زیادہ اپنے ''ردِتشکیل'' (کسی متن کو بار بار پڑھنا اور اس کی ردِتشکیل کرنا تاکہ اس میں موجود متعدد معانی کو ظاہر کیا جاسکے۔ ردِتشکیل کے اس نظریے کے تحت زبان پر زیادہ توجہ دیتے ہوئے وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ کسی بھی اقتباس کا روایتی یا مابعد الطبیعاتی مطالعہ بہت سارے غلط مفروضات کو جنم دیتا ہے۔) کے نظریے کے لیے جانے جاتے ہیں۔ اس نظریے کے تحت دریدا کا ماننا ہے کہ زبان مشمولات اور ناقابلِ تغیر نظریات کو ادا کرنے کے لیے کافی ہوتی ہے اور کسی اقتباس کا خالق ہی اس اقتباس کے معنی کا مصدر و مرجع ہے۔ زبان کے سلسلے میں دریدا کا نظریہ یہ ہے کہ بول چال کے مقابلے میں تحریر کا درجہ ثانوی ہے۔

''دریدا کی موت ایک عظیم سانحہ ہے۔ اس نقصان کی تلافی غیر ممکن ہے۔ دریدا بیسویں صدی کے ذہین ترین انسان تھے۔ ہمارے کلاسیکی فلسفیانہ فکر میں ان کی خدمات بہت اہم ہیں۔ لیکن دریدا مشکل فہم اور پیچیدہ قسم کے قدیم فلسفے اور انسان و انسانیت سے جڑے موجودہ مسائل کے درمیان ایک رابطے کی حیثیت بھی رکھتے تھے۔'' یہ خیال ہے فیارڈ (Fayard) میں ان کے ناشر اولیویر بیٹورنے (Olivier Betourne) کا۔

''De quoi demain......' (اور کل کیا ہوگا......) جو کہ نفسیاتی تجزیہ کار الیزابیتھ روڈینسکو (Elizabeth Roudinesco) کے ساتھ ان کی مشترکہ تصنیف ہے، میں انھوں نے عصرِ حاضر کے بہت سارے سلگتے ہوئے مسائل مثلاً: سزائے موت، انسان، جانوروں اور فطرت کے درمیان رشتہ، یہودیت مخالفت کی صورتیں اور تکنیک کی مدد سے افزائشِ نسل کا ذکر کیا ہے۔

دریدا کے دوسرے تمام کاموں پر ردِتشکیل کے نظریے کو فوقیت حاصل ہے۔ ان کے تمام کاموں میں اس کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اس نظریے کے تحت دریدا نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ زبان متواتر بدلتی رہتی ہے اور کسی بھی اقتباس کی بہت ساری جائز تشریحیں ہوسکتی ہیں۔ اس لیے معنی، حقیقت اور استقلال کے معاملے میں کوئی بھی انسان کامل نہیں ہوسکتا۔ ان کے اس تصور کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی بطور خاص امریکہ میں لوگوں نے اس تصور کو بہت سارے موضوعات مثلاً ادب، لسانیات، بشریات، فنِ موسیقی، فنِ تعمیر اور سیاسیات میں آزمایا ہے۔ اس نظریے نے لوگوں میں شیکسپیئر اور قدیم یونانی فلسفیوں کو پڑھنے کی ذوق کو فروغ دیا ہے جس سے ان کی تحریروں میں چھپی ہوئی جانبدارانہ میلانات اور تضادات ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ نتیجتاً دریدا کے چاہنے والوں میں مساواتِ نسواں کے حامیوں، تیسری جنس کے کارکنندگان اور دوسرے پسماندہ طبقوں کی اہم تعداد ہے۔ ان لوگوں نے امتیازی سلوک، جنسی و نسلی بھید بھاؤ کے خلاف ان کے اس نظریے کا تجربہ کیا ہے۔

دریدا نے خود تو اس نظریے کی تعریف کرنے سے انکار کیا ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ کسی بھی اقتباس کے بار بار کے ردِتشکیلی مطالعے سے ہی اس نظریے

● جیکس دریدا کا شمار دورِ حاضر کی مشہور و ممتاز فلسفیوں میں ہوتا ہے۔ انہیں نظریۂ ردِتشکیل کی وجہ سے دنیا بھر میں شہرت حاصل ہوئی۔ گذشتہ 19/ اکتوبر کو پیرس میں دریدا کا انتقال ہوگیا۔ بطور خراجِ عقیدت قارئین ''اردو دنیا'' کے لیے دریدا پر دو مضامین پیش کیے جارہے ہیں۔

تک پہنچا جاسکتا ہے۔" ردِ تشکیلی نظریے کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ کسی خیال، رواج یا کچھ اقدار کو لیا جائے اور پھر ان کے اس باہمی ربط کو جوان کو تشکیل دیتا ہے ہٹا کر اس کے طریق کار کو سمجھا جائے۔" یہ تعریف کی ہے ان کے ایک ناقد نے۔

دریدا کی تقریر میں پر جوش طلبہ اور ان کے ہم پیشہ تعلیمی دوست خوب جمع ہوتے تھے۔ گہرا سانولا رنگ، جاذبِ نظر لباس، خوبصورت چہرا اور سر پر قبل از وقت پکے ہوئے سفید بال ان کی جاذبیت کو اور بڑھا دیتے تھے۔ جس سے لوگ ان کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔ دریدا کی تقریر ابہام، قافیہ پیمائی اور پیچیدہ بیانات پر مبنی ہوتی تھی۔

لیکن جبکہ دریدا کی تحریریں جرمن فلسفی مارٹن ہیڈگر (Martin Heidegger) اور ایڈمنڈ ہسرل (Edmund Husserl) سے کافی متاثر تھیں۔ دوسری اہم شخصیتوں میں جس سے دریدا متاثر تھے کارل مارکس اور سگمنڈ فرائڈ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ دریدا کے متعدد ناقدین کا کہنا ہے کہ وہ ایک منفی، پیچیدہ، بے ربط، مروجہ نظام کے مخالف اور تخریب پسند انسان تھے۔ نیویارک میگزین ٹائمس میں ان کے ایک ناقد نے کہا کہ" بہت سارے صاف دل لوگ اس بات کی امید کرتے تھے کہ دریدا کا نظریۂ ردِ تشکیل ختم ہو جائے گا اور انھیں اس کے ابہام و تفہیم کی زحمت سے نجات مل جائے گی۔" جب کیمبرج یونیورسٹی نے دریدا کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دینے کا فیصلہ کیا تو یونیورسٹی کے مدرسین نے ان کے خلاف ایک بہت بڑا احتجاج کیا جس میں دریدا کو 336-204 ووٹ ملے۔

دریدا 1930 میں الجیریا کے ایک بائیں بازو کے یہودی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے فرانس کے عظیم ترین فکری ادارے اکول نارمیل سپیریر میں تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد انھوں نے ہارورڈ یونیورسٹی امریکہ اور ساربونے یونیورسٹی پیرس میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ اسکول آف ایڈوانسڈ اسٹڈیز ان سوشل سائنسز میں پروفیسر ہونے کے بعد وہ لگاتار امریکہ اور فرانس میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔

اس میں شک نہیں کہ دریدا ایک سنجیدہ کلاسکی مفکر تھے لیکن وہ فرانس کے روایتی فلسفے، جو سماجی سرگرمی سے خالی نہیں، کے ساتھ گہرے طور پر جڑے رہے۔ دریدا نے اس راہ میں جاں پال سارتر جنھوں نے 1968 کے انقلاب یا پیرے بورڈیو (Piere Bourdieu) کو کافی متاثر کیا تھا، کا نظریہ اپنایا۔ 1970 کی دہائی میں وہ کمیونسٹوں کی طرف سے امتیازی سلوک اور آزادیٔ فکر پر عاید پابندیوں کے خلاف اپنے موقف کے لیے معروف ہوئے (77 کے چارٹر کی تائید کے لیے وہ چیک حکومت کی طرف سے قید کیے گئے۔)

1980 کی دہائی میں انھوں نے مہاجرین کے لیے حقِ رائے دہی کی حمایت میں آواز اٹھائی۔ ابھی حال ہی میں دریدا نے واشنگٹن سے جاری ہونے والے نیو کنزرویٹو خیالات پر سخت تنقید کی۔ دریدا نے اپنی کتاب "دی کانسپٹ آف ستمبر 11" (The Concept of September 11) میں تنگ نظری پر مبنی جدید اصول" پروجیکٹ فار اے نیو امریکن سنچری" جس کو امریکی داداگیری قائم رکھنے والے پال اولف وٹز (Paul Wolfwitz) ڈک چینی (Dickch Cheney) اور ڈونالڈ رمسفیلڈ نے پیش کیا تھا اور جو بعد میں بلاواسطہ طور پر عراق پر فوج کشی کا سبب بھی بنی، کی دھجی بکھیرتے رہے۔ دریدا اپنی اس کتاب میں فلسفیوں کو عالمی سیاسی تبدیلیوں کو جانچنے اور اس پر عمل کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے" آج فلسفے کا فریضہ یہ ہے کہ کچھ کرے اور اس کو عملی طور پر سوچے۔"

دریدا کا یہ بھی ماننا تھا کہ آگے بڑھنے کا ایک طریقہ مسیحیت کے بغیر مسیحائی بھی ہے۔ یہ طریقہ حاصل ہوتا ہے تمام کمزور طاقتوں کا کسی منظم مذہب کے عمل دخل کے بغیر ایک ساتھ جمع ہونے سے۔ انھوں نے ایک تصوراتی نظریہ پیش کیا کہ پسماندہ لوگ محنت اور جدوجہد سے اس زمین کے وارث بن سکتے ہیں۔"

بغیر مسیحیت کے مسیحائی کا ایک نمونہ عالم کاری کے خلاف چلنے والی تحریکوں میں بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے حال ہی میں اپنی ایک ملاقات میں کہا تھا" ابھی بھی بہت ساری تحریکیں ایسی ہیں جو مختلف العناصر اور کچھ حد تک غیر تشکیل شدہ ہیں، اس میں بہت سارے تضاد پائے جاتے ہیں، لیکن اس کے باوجود دنیا کی ان تمام پسماندہ اور کمزور طاقتوں کو ایک ساتھ جمع کرتی ہیں جو کہ اقتصادی داداگیری، اوپن مارکیٹ اور مطلق العنانی کی مار جھیل رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ وہی مزدور لوگ ہیں جو آخرکار طاقتور بنیں گے اور مستقبل کی نمائندگی کریں گے۔"

دریدا نے پیشین گوئی کی تھی کہ ایک بار اختلاف دور ہو جانے کے بعد "عالم کاری کے خلاف چلنے والی یہ تحریکیں" دنیا پر اپنی داداگیری چلانے والی تنظیموں کے خلاف آگے بڑھیں گی، صرف امریکہ ہی نہیں بلکہ" آئی ایم ایف"، جی 8 اور دوسرے مالدار اور طاقتور ملکوں، جن میں یورپ بھی شامل ہے۔ یہ ایسی تحریکیں ہیں جو امن اور انصاف، مذہب سے آزادی اور کچھ حد تک مذہب کے بغیر عقیدے کی وہ تصویر پیش کرتی ہیں جس کو میں مسیحیت کے بغیر مسیحائی کہتا ہوں۔

دریدا کی اس وقت کافی رسوائی ہوئی جب 1987 میں یالے یونیورسٹی میں اس بدعنوانی کا انکشاف ہوا کہ نظریۂ ردِ تشکیل کے اہم حامی پروفیسر پال ڈی مین، جن کا چار برس پہلے انتقال ہوگیا تھا، نے اپنے علاقے بلجیم میں 1940 کی دہائی میں نازیوں کی حمایت اور یہودی مخالفت میں لکھے گئے 150 سے زائد مضامین میں اعانت کی تھی۔ ڈی مین کے ساتھ دوستی کی وجہ سے

دریدا پر کافی تنقید کی گئی۔ اگرچہ انھوں نے یہ تسلیم کیا ہے کہ جنگ کے دنوں میں مرحوم پروفیسر کا رویہ یہودی مخالف محسوس ہوتا ہے۔ اسی طرح ان کی شخصیت اس وقت ایک بار پھر مجروح ہوئی جب 1987 میں اس بات کا پتہ چلا کہ ان کے ایک مفکر ہیرو اور جرمن فلسفی مارٹن ہیڈیگر 1933 سے 1945 تک نازی پارٹی کے ایک سرگرم رکن رہے ہیں۔ دریدا نے ایک بار پھر ماضی میں ہیڈیگر کے نازی ہونے کی تردید کی، لیکن اس بات پر قائم رہے کہ اس سے ان کے فلسفے کی معقولیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

دریدا کے فرانسیسی دوست اور ساتھی ان کے اینگلوسیکسن ناقدین کے خلاف سخت رخ رکھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے اپنے دوفاشسٹ دوستوں کے ساتھ دریدا کے تعلقات سے ان کے فلسفیانہ کام کی خصوصیات اور اہمیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ایک مشہور فرانسیسی تبصرہ نگار جو کہ دریدا کے ساتھ یونیورسٹی میں رہ چکے ہیں جناب الیگزینڈر رائیڈ کا ان کے بارے میں کہنا ہے "جن لوگوں کو میں جانتا ہوں دریدا ان میں یقیناً ایک نیک انسان تھے۔"

جناب بیٹورنے (Betourne) کہتے ہیں "وہ ہمیشہ رس اور انجس (Ris Orangis) کے ایک بالکل سادہ علاقے کے نیم شہری اور الگ تھلگ گھر میں رہے۔ دوستی، مہمان نوازی، سخاوت ان کی کچھ ایسی خصوصیات ہیں جن پر وہ ہمیشہ قائم رہے۔ ان کی موت صرف اسی وجہ سے ایک بڑا نقصان نہیں کہ ایک عظیم مفکر دنیا سے اٹھ گیا بلکہ اس وجہ سے بھی کہ ایک عظیم انسان اب اس دنیا میں نہیں رہا۔

دریدا کا امارت پرستی اور دنیاداری کو کوئی اہمیت نہ دینا ان کی پیرس کی مفکرانہ زندگی کی نشاندہی کرتا ہے۔

(بشکریہ "دی ہندو" نئی دہلی، 14 اکتوبر 2004)

□□□

جنوبی ہند کی تاریخ

مصنف: کے ایل نیل کنٹھ شاستری

مترجم: آر کے بھاٹاگر

جنوبی ہند کی تاریخ پر بہت کم کتابیں لکھی گئی ہیں۔ کتاب میں جنوبی ہند کی قدیم تاریخ سے سترھویں صدی کے نصف اوّل تک کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

(دوسرا ایڈیشن)

صفحات: 576، قیمت: 114 روپے

دکنی نثر کا انتخاب

مرتبہ: سیدہ جعفر

دکنی نثر کا یہ انتخاب دکن میں اردو نثر کی ابتدا سے فورٹ سینٹ جارج کالج کے زمانے تک کے مصنفین کا احاطہ کرتا ہے اور ان کی تصانیف کے نمائندہ منتخبات پر مشتمل ہے۔

صفحات: 168، قیمت 45 روپے

سخنورانِ گجرات

مرتب: سید ظہیرالدین مدنی

گجرات میں اردو شعر و ادب کی نشاندہی پندرھویں صدی کے نصف آخر سے کی جاتی ہے۔ اس کتاب میں ابتدا سے 1950 تک کے شعرا کا تذکرہ اور ان کے کلام پر تبصرہ، سیاسی اور سماجی پس منظر کے ساتھ درج ہے۔

دوسرا ایڈیشن، صفحات: 340، قیمت: 77 روپے

کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ

مرتبہ: ڈاکٹر سیدہ جعفر

گولکنڈہ کا پانچواں تاجدار محمد قلی قطب شاہ بہ یک وقت کئی اوصاف سے متصف تھا۔ اس کا ایک اہم وصف شعر گوئی بھی تھا۔ یہ اس کا مستند کلیات ہے جس میں مشکل الفاظ کی فرہنگ بھی شامل ہے۔

(دوسرا ایڈیشن)

صفحات: 824، قیمت: 157 روپے

قطب مشتری

مصنف: اسد اللہ وجہی

"قطب مشتری" اردو کی ابتدائی طبع زاد مثنویوں میں کئی لحاظ سے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ مثنوی کے متن کے ساتھ سو صفحوں پر مشتمل عالمانہ مقدمے نے کتاب کی قدر و قیمت مزید بڑھا دی ہے۔

(چوتھا ایڈیشن)

صفحات: 234، قیمت: 48 روپے

کلیاتِ سراج

سراج اورنگ آبادی

مرتب: عبدالقادر سروری

سراج اورنگ آبادی اردو کے کلاسیکل شاعروں میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ دیباچے میں ان کی شاعرانہ خصوصیات اور ان کے شخصی اوصاف کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔

(دوسرا ایڈیشن)

صفحات: 732، قیمت: 138 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

مدن لال کپور

افکارِ دریدا

بیسویں صدی کے آخر میں اشتراکیت اپنے مارکسی فلسفے کی مادی جدلیت کے ساتھ دم توڑ گئی۔ فرائڈ کا نظریۂ تحلیل نفسی اپنے لاشعور اور تحت الشعور کی جبریت کے ساتھ دقیانوسیت کا شکار ہوگیا۔ وجودیت کا رنگ سارتر کی خدا، سماج اور فطرتِ انسانی کی جانب منفیت کے ساتھ پھیکا پڑنے لگا۔ نئی فکر بیسویں صدی میں تراشے گئے بتوں کے انہدام کی جانب سرگرمِ سفر نظر آئی۔ پوسٹ ماڈرنزم اپنے 'ازم' کے باوجود اینٹی ازم کا نظریہ بن کر زبان، ادب، مصوری، موسیقی، سنگ تراشی اور علمِ سماج کے افق پر نمودار ہوا۔ اس نظریے کے علم برداروں میں جیکس دریدا ایک اہم نام ہے۔ نیا فلسفۂ لسان جو سوسیر نے 1913 میں پیش کیا وہ ساختیات اور جدیدیت کی مسافتیں طے کرتا ہوا پس ساختیات اور مابعد جدیدیت (پوسٹ ماڈرنزم) کی منزل تک آپہنچا۔ (ممکن ہے یہ منزل بھی ایک مسافت ہو۔) انسانی فکر کے اس معرکہ خیز سفر کے ممتاز ہم سفروں کے نام ہیں: جیکب سن، نوم چامسکی، لیوتار آستھیو سے لیوی سٹراس، رولاں بارتھ اور جیکس دریدا۔ ہندستانی مفکر ہومی بھابھا اور گائتری چکرورتی دریدا کے نظریے ڈی کنسٹرکشن یعنی ردِ تشکیل کے ساتھ اتفاق رکھتے ہیں اور اپنے نظریاتی رجحان کے ساتھ دریدا کی فکر کی اشاعت بھی کرتے ہیں۔

دریدا 19/اکتوبر 2004 کے دن پیرس میں ایک اسپتال میں انتقال فرما گئے۔ ان کی عمر 74 سال کی تھی۔ وہ 1930 میں الجیریا میں ایک یہودی خاندان میں پیدا ہوئے۔ جب وہ اسکول میں تعلیم حاصل کر رہے تھے تو ان کو اسکول سے نکال دیا گیا کیونکہ وہ یہودی تھے۔ اسکول کے حاکموں کے مطابق ان کا یہودی ہونا انھیں تعلیم حاصل کرنے کے قابل نہیں بناتا تھا۔ وہ پیرس میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد امریکا کی ہارورڈ یونیورسٹی میں درس و تدریس کے فرائض انجام دینے لگے۔ پھر دیگر یونیورسٹیوں، ہاپکنس ییل اور کیلی فورنیا نے انھیں خصوصی لیکچر دینے کے لیے مدعو کیا۔ ارون یونیورسٹی نے فلسفہ، فرانسیسی زبان اور تقابلی ادب پڑھانے کے لیے انھیں پروفیسر شپ پیش کی۔ دریدا نے ہسرل اور ہیڈیگر کے فلسفے کا گہرا مطالعہ کیا۔ ان کے مطالعے اور علم کی گہرائی نے ان کی تصانیف کو قارئین کے لیے دقیق اور مشکل بنا دیا۔ وہ ابہام پسند تصور کیے جانے لگے۔ 1992 میں کیمبرج یونیورسٹی انھیں کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری دینے لگی تو کئی اساتذہ نے اعتراض کیا کہ دریدا کی تحریریں لغو اور مہمل ہیں، لیکن اساتذہ برادری کی رائے کی بنا پر دریدا کو ڈگری پیش کر دی گئی۔ دریدا کے حق میں 334 ووٹ پڑے جبکہ مخالفت میں 204۔

دریدا کے مطابق الفاظ اور متن، text کی پیچیدگی، ان کے معانی اور مطالب کی روح ہوتی ہے۔ ان کو آسان بنانے کی کوشش یعنی ان کی simplification متن کے حقیقی معنی کو مجروح اور تباہ کر دیتی ہے۔ متن اور الفاظ کو سمجھنے کا صحیح ذریعہ ان کی Deconstruction یعنی ان کی تشکیل کو رد کرنا ہے۔ اس ردِ تشکیل کا راستہ متن کی قرأت (Reading) سے گزرتا ہے۔ دریدا متن اور قرأت کے بارے میں چند ضروری انکشافات کرتے ہیں۔ (1) قرأت کے بارے میں ہمارے بیشتر مفروضات غلط ہیں۔ (2) یہ عام عقیدہ غلط ہے کہ زبان ہر طرح کے تصورات کو بغیر ان کے معنی بدلے بیان کر سکتی ہے۔ (3) زبان کے مراتب کے بارے میں یہ خیال غلط ہے کہ تقریر اول ہے اور تحریر ثانوی۔ (4) یہ نظریہ بھی غلط ہے کہ متن کے حقیقی مطالب کا علم صرف مصنف کو حاصل ہے۔ (5) متن کے معانی مقرر کرنے میں قاری کا اہم رول ہے۔ (6) لفظ ایک جامد اکائی نہیں ہے۔ قرأت اس کو مختلف معانی عطا کرتی ہے۔ یہ معانی کی وحدانیت کو رد کرتی ہے اور معانی کی کثرتیت کو تسلیم کرتی ہے۔ دریدا کے ان افکار نے متن اور تصنیف سے متعلق ہمارے تصورات میں انقلاب پیدا کر دیا۔ متن کے مطالب مقرر شدہ یا جامد نہیں ہیں اور نہ ہی مصنف اس کا آخری مفسر ہے۔ ہر قاری ایک مفسر ہے اگر وہ متن کی بناوٹ، ساخت یا تشکیل کو پرت در پرت رد کرتا ہے اور اس کے معانی کی مطلقیت پر ضرب لگاتا ہے۔

مابعد جدیدیت بشمول ردِ تشکیل کا پس منظر اور نقطۂ آغاز اٹھارھویں صدی کا فرانس ہے۔ یہ روشن خیالی کا عہد دانشوروں کے لیے ایک سنہری دور تھا۔ ان کو اپنے ذوق و شوق کے فروغ کے لیے سہولیات میسر تھیں۔ جم پاول اپنی کتاب Post Modernism for Beginners میں لکھتے ہیں۔ "قہوہ خانوں میں جانے والے بہت سے لوگ ذہین اور مہذب تھے۔ وہ خورد و نوش کی اشیا کے لیے آرڈر دیتے اور سگریٹ کے لیے ادھر ادھر ہاتھ بڑھاتے۔ میز پر بیٹھنا اور میز کے بارے میں باتیں کرنا ان کا نہایت دلچسپ مشغلہ تھا۔ وہ اکثر آنکھوں کو نچاتے ہوئے سوال پوچھتے۔ "کیا ہنر ہے؟" (ص-98)

کئی سال تک میز کی ہستی کے بارے میں ہزاروں سوالات پوچھتے پوچھتے وہ 1940 میں ژاں پال سارتر کے دور میں داخل ہوئے جب فرد کی آزادی کے ساتھ اس کے احساسِ ذمے داری کو بھی ابھارا گیا۔ دانشوروں اور ادیبوں نے سیاسی سوالات اور مسائل میں دلچسپی لینا شروع کر دیا۔ فرانسیسی طلبہ اور مارکسیوں کی مدد سے حکومت کا تختہ الٹنے میں قریب قریب کامیاب ہوئے۔

لیکن فوراً اس انقلاب کو کچل دیا گیا اور وہ یاسیت اور مایوسی کا شکار ہو گئے۔ مارکسزم ان کے نزدیک ایک مشکوک نظریہ بن گیا۔ اب ان کی تمام تحقیقی اور تخلیقی قوتیں فلسفۂ لسان (زبان) کی جانب منتقل ہو گئیں۔ وہ سیاسی کارکن نہ رہ کر ماہر لسان بن گئے۔ انھوں نے زبان اور ادب کی قرأت اور تحریر کی طرف اپنی ساری توجہ لگا دی۔

قرأت کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے دریدا نے بائنری (Binary) یعنی دو مخالف اور متضاد حدود کے جوڑوں کا سہارا لیا۔ اور اس طرح متن اور عبارت کے تغیر پذیر معانی کا مطالعہ کیا۔ جم پاول اس طریقۂ کار کو بڑے سادہ ڈھنگ سے یوں پیش کرتے ہیں۔ ایک شکل میں ''چہرہ'' اور ''موم بتی'' دو مختلف صورتیں موجود ہیں۔ پہلے ایک صورت یعنی چہرہ ہماری توجہ کا مرکز بن جاتا ہے اور موم بتی کو حاشیے پر دھکیل دیتا ہے، اور اس طرح وہ توجہ اور قرأت کا مرکز بنا رہتا ہے۔ لیکن تضاد اور اختلاف کے نہ ٹھہرنے والے کھیل کے سہارے دوسری صورت یعنی موم بتی مرکزی مقام حاصل کر لیتی ہے اور یہ کھیل مسلسل جاری رہتا ہے۔ اس تماشۂ جاریہ کو روکنا متن کو ایک ہی معنی میں جکڑ دینا ہے۔ دریدا کے نظریۂ ردِ تشکیل کے مطابق کوئی مرکز بھی بائنری کھیل کو روک نہیں سکتا کیونکہ ردِ تشکیل کا عمل جاری ہے۔

جم پاول کے مطابق مراکز کی تعمیر اور ایجاد ہماری زبان اور اس کے ساتھ ہماری فکر کو بھی ادارہ بندی اور آمریت کا شکار بنا دیتی ہے۔ وہ اس بات کا اعتراف بھی کرتا ہے کہ اگر تمام متن معانی کا رقص اور کھیل نہیں، تو سیاسی ایکشن کی بنیاد کا انہدام یقینی ہے کیونکہ سیاسی منشور اپنے مقاصد کا واضح اور مستقل متن ہیں جن کے معانی کی عارضیت کل متن کو ناقابلِ اعتبار بنا دے گی۔ مارکسسٹ اور فیمی نسٹ یعنی حرمتِ نسواں کے علم برداروں کے مطابق ردِ تشکیل کا نظریہ سیاسی عمل اور تنقید کو بے معنی، غیر معتبر اور بے مقصد بنا دے گا۔

(بشکریہ ''قومی آواز''، دہلی 7 نومبر 2004)

بدھ کی کہانیاں

مصنف: اجیا کمد

بودھ مذہب کے بانی مہاتما بدھ ایک عظیم انسان تھے جنھوں نے اپنی زندگی کو عملی نمونہ بنا کر عوام کے سامنے پیش کیا۔ انھوں نے ستیہ اور اہنسا کے اصولوں پر بے حد زور دیا اور ہر ذی روح کے ساتھ محبت اور ہمدردی کے ساتھ پیش آنے کا درس دیا۔ کہانیوں کی یہ کتاب گوتم بدھ کی زندگی کے واقعات سے ترتیب دی گئی ہے۔

صفحات: 80، قیمت: -/65 روپے

تینالی رمن کی کہانیاں

مصنف: سی ایل ایل. جیا پرودا، مترجم: نامی انصاری

شمالی ہند میں جس طرح بیربل کی حاضر جوابی اور ذہانت کی کہانیاں مشہور ہیں اسی طرح جنوبی ہند میں تینالی رمن کی کہانیاں زباں زد عام ہیں۔ وہ اپنی غیر معمولی ظرافت، عقل مندی، رحم دلی اور خوش تدبیری کے باعث وجے نگر کے راجا کرشن دیو رائے کا درباری شاعر بن گیا تھا اور کئی موقعوں پر اس نے راجا کی مشکلیں آسان کیں۔ اس کتاب میں ایسے ہی کچھ دلچسپ واقعات درج کیے گئے ہیں۔

صفحات: 72، قیمت: -/60 روپے

ہندستان کا صنعتی ارتقا

مصنف: ڈاکٹر ڈی آر. گیڈگل، پروفیسر ایم صدیقی

ہندستان کی تاریخ میں 1857 ایک اہم سنگ میل ہے۔ اس سال نہ صرف ملک پر پوری طرح سے انگریز قابض ہو گئے بلکہ اس کے بعد ہندستانیوں کی خود احتسابی کا دور بھی شروع ہوا جس کے نتیجے میں مختلف اصلاحی تحریکات وجود میں آئیں اور ملک نشاۃ ثانیہ سے ہم کنار ہوا۔ 1857 کے بعد سے ہی صحیح معنوں میں ہندستان کی صنعتی ترقی بھی شروع ہوئی۔ اس کتاب میں 1860 سے 1939 تک ملک کے صنعتی ارتقا کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔

صفحات: 343، قیمت: -/130 روپے

صنعتی تنظیم اور انتظام

مصنف: محمد احترام اللہ

آج کے صارفی سماج میں انتظامی شعبے کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ ایک کامیاب منتظم حال پر نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ مستقبل کے لیے منصوبہ بندی بھی کرتا رہتا ہے۔ یہ کتاب نہ صرف بی. کام کے طالب علموں کی ضرورت کو پورا کرتی ہے بلکہ علم دوست اردو قاری کو بھی جدید صنعتی شعبے اور معیشت کے دیگر رموز سے آگاہ کرتی ہے۔

صفحات: 606، قیمت: -/149 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسبِ ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

تحریر: راجندر راجن
ترجمہ: جاوید اقبال

ڈیڑھ صدی کی ڈاک

چٹھی آئی ہے، چٹھی آئی ہے۔ یہ گیت کس نے نہیں گنگنایا ہوگا۔ ''نام'' فلم کے اس گانے کی اصلیت ٹیلی فون، ای میل اور ایس. ایم. ایس سے آراستہ جدید نسل کو شاید ہی سمجھ میں آئے۔ جس نے نہ کبھی کسی کو خط لکھا ہو اور نہ کسی کے خط کا انتظار کیا ہو، اس کے لیے خطوں کے ساتھ جڑی خوشی کی کیفیت کو محسوس کر پانا ممکن بھی نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ خبر رسانی کے اس دور میں بات چیت کے لیے خط کا وسیلہ بہت سست اور پرانا لگنے لگا ہے لیکن انسان کے دکھ سکھ کا جیسا اظہار خطوں میں دکھائی دیتا ہے، اس کا تصور جدید ذرائع ترسیل اور فوری طور پر مہیا ذرائع کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا۔

فون پر ہلو کے ساتھ بات شروع کرنے والوں یا دنیا کے کسی بھی حصے میں فوراً ای میل بھیجنے والوں کو شاید یہ خیال بھی نہ آئے کہ آج بھی پیغام بھیجنے کے لیے ڈاک کے انتظامات پر منحصر ملک کے کروڑوں لوگ خط لکھتے یا لکھاتے وقت کتنے جذباتی ہو جاتے ہیں۔ اپنے لاڈلوں کی خیریت کی خبر پانے کی چاہت اور ان کی خیر و عافیت کے لیے خدا سے دعا کرتے ہوئے لکھے جانے والے خطوط جس قدر اپنائیت سے لبریز ہوتے ہیں کیا اس کا احساس کسی اور مراسلاتی ذریعے میں ہمیں ہو پاتا ہے! آج کی دنیا تیز رفتار اور جلد بازی کی ہے، اس لیے موبائل فون اور انٹرنیٹ اسے محبوب ہے، جب کہ خط ہمیں صابر سماج کا پتہ دیتے ہیں جس میں ہفتوں تو کیا مہینوں تک کسی کی چٹھی آنے کا بیتابی سے انتظار رہتا تھا۔ چاہے غیر ممالک کمانے گئے شوہر یا بیٹے کا حال جاننا ہو یا اسے گھر گاؤں کی خبر بھیجنی ہو، خط ہی واحد ذریعہ تھا۔ ایسے لامحدود خطوں میں ملک کے عام لوگوں کا سکھ دکھ اور زندگی کا جتنا پورا درج ہوا ہوگا، وہ بھلا اور کہاں مل سکتا ہے۔

خطوط کے ساتھ انسان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو بھی یاد کیا جا سکتا ہے۔ کوئی خط پانے کے لیے بے چین رہتا ہے تو کوئی خط لکھنے کا وعدہ کر کے بھی ٹالتا جاتا ہے۔ لکھ لینے کے بعد بھی خط وقت پر لیٹر بکس میں ڈال دیا جائے گا اس کی کوئی گارنٹی نہیں دی جا سکتی ہے۔ ایسا تقریباً ہر ایک کے ساتھ ہوا ہوگا کہ بھیجے جانے والے خط کئی بار جیب میں ہی پڑے رہ جاتے ہیں۔ بھولنے کی عادت تو یہاں تک ہے کہ کچھ لوگ خط تو پوسٹ کر دیتے ہیں، لیکن پتہ لکھنا یا ٹکٹ چسپاں کرنا ہی بھول جاتے ہیں۔ دراصل خط ہم سے ایک نظم و ضبط کا مطالبہ کرتا ہے۔ گاندھی جی میں یہ نظم و ضبط غضب کا تھا جو خط ملنے کے دن ہی اس کا جواب لکھ دیتے تھے۔ اس کام میں جب ان کا دایاں ہاتھ تھک جاتا تھا تو وہ بائیں ہاتھ سے لکھنے لگتے تھے اور دونوں ہاتھوں کے جواب دے دینے پر ہی کسی کی مدد لیتے تھے۔ مگر خطوں کا جواب ٹالنا کسی بھی صورت میں انھیں منظور نہیں تھا۔

گاندھی جی کے ذکر سے ایک بات کا خیال آیا کہ وہ لوگ کتنے خوش قسمت رہے ہوں گے جنھیں ان کے خط ملے ہوں گے۔ ان کے یا تاریخ پر اپنی گہری چھاپ چھوڑنے والے کسی بھی انسان کے خطوط قیمتی ورثے ہیں۔ خطوط کے ان ڈھلتے دنوں میں اس بات کی یاد دہانی ضروری ہے کہ ایسے خطوط میں کتنی ادبی اہمیت اور غور و فکر والی باتیں درج ہیں۔ کیا ہم مراسلاتی ادب کا تصور کر سکتے ہیں! اطمینان سے سوچ سمجھ کر لکھے جانے والے خطوں میں تاریخی مواد یا ادب کا درجہ پا سکنے کی جو امید ہے وہ ٹیلی فون کی چٹ پٹی بات چیت میں نہیں ہو سکتی، بھلے ہی انھیں ریکارڈ کر لیا جائے۔

خطوں کے ساتھ ڈاکیے کی یاد نہ آئے، یہ ہو نہیں سکتا۔ ڈاک محکمہ اور ڈاکیہ کی جیسی پہنچ ملک کے عام لوگوں تک ہے، ویسی کسی اور محکمے یا ملازم کی کبھی نہیں رہی۔ چاہے شہروں، قصبوں میں رہنے والے لوگ ہوں یا گاؤں اور دور دراز کے جنگلوں میں بسے ہوئے لوگ، ڈاکیہ ہر جگہ پہنچتا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب وہ پیدل ہی لوگوں کا خط پہنچاتا تھا۔ آج بھی عام آدمی کی سواری سائیکل ہی اس کا ذریعہ ہے۔ یہی ایک سرکاری ملازم رہا ہے جس سے لوگوں کو کبھی خوف نہیں محسوس ہوا، بلکہ لوگ اس کے بدلے اپنا پن ہی محسوس کرتے ہیں۔ ہمیشہ اس کا انتظار اور استقبال ہوتا رہا ہے۔ اسے تہوار کے موقعے پر کچھ نہ کچھ تحفہ دینے کی روایت سی رہی ہے۔ ڈاکیے بھی اسی طرح پیش آتے رہے ہیں جیسے وہ حکومت کے نہیں بلکہ سماج کا حصہ ہوں۔ غیر تعلیم یافتہ لوگوں کے خطوط پڑھ کر سنا دینا یا لکھ دینا اسی لگاؤ کی ایک جھلک ہے۔ وہ ہر راستے، ہر گھر اور ہر آدمی کو پہچانتے ہیں۔ ہندستان میں جہاں حکومت اور عام آدمی کے بیچ گہری خلیج رہی ہے اور ڈر کا رشتہ رہا ہے، وہاں ڈاکیے کو اس کے برعکس کہا

جاسکتا ہے۔ اس کے دوسرے سرے پر ہم پولیس کے محکمے کو رکھ سکتے ہیں جن سے لوگ ہمیشہ ڈرتے ہیں۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ ڈاکیہ اور پولیس کے سپاہی کی وردی کا رنگ ایک ہی رہا ہے۔ اسے ایک خوشگوار تبدیلی ہی کہا جاسکتا ہے کہ اب ڈاکیے کی وردی کو خاکی سے بدل کر نیلا کر دیا گیا ہے۔

ڈاکیے کی طرح محکمۂ ڈاک بھی ریاست کی فلاح و بہبود کا نمائندہ کہلائے جانے کا مستحق ہے۔ آج بھی پوسٹ کارڈ ہی پیغام بھیجنے یا پانے کا سب سے سستا ذریعہ ہے۔ پوسٹ کارڈ پر سرکار جتنی چھوٹ دیتی رہی ہے، اتنی کسی اور چیز پر نہیں۔ کم ہی لوگوں کو پتہ ہوگا کہ ایک پوسٹ کارڈ پر، جو ملک میں کہیں بھی آپ کے جذبات، خیرخبر، پیغام، خیالات یا کسی بات کا جواب لے جاتا ہے، اس عمل میں سات روپے کا خرچ بیٹھتا ہے۔ کیا کوئی اور چیز یا خدمت ہے جو خرچ سے اتنے کم پر فراہم ہوتی ہو! یہ ہمیشہ ہی عام لوگوں کے لیے حکومت کی فلاحی سوچ کو نمایاں کرنے کی علامت بنا رہا ہے۔ اس لیے پوسٹ کارڈ کی قیمت بڑھانے پر ہمیشہ مخالفت ہوئی ہے۔ حالانکہ ڈاک کی دوسری چیزیں مہنگی ہیں، مگر پوسٹ کارڈ آج بھی سستا ہے۔ جس پچاس پیسے کو ہم دکاندار کے پاس کھلے نہ ہونے پر یوں ہی چھوڑ کر چل دیتے ہیں، وہ ایک پوسٹ کارڈ دلا سکتا ہے۔ سستا ہونے کی وجہ سے اس کا تب غلط استعمال ہوا جب کچھ ٹیلی ویژن کے پروگراموں کے شائقین کا ردِعمل یا جوئے جیسے مقابلے میں شامل کرنے کے لیے اسے استعمال کیا گیا۔ اس طرح جو پوسٹ کارڈ عام لوگوں کے لیے حال چال جاننے اور بھیجنے کا سب سے سستا اور آسان ذریعہ تھا، وہ ایک وقت ٹیلی ویژن کے پروگرام کے لیے اپنا بازار بڑھانے کا وسیلہ بن گیا۔ اس کے خلاف احتجاج ہوا اور آخر کار سرکار کو اس پر روک لگانی پڑی۔ لیکن منصوبے کے تحت سبسڈی کے خلاف جیسی مہم چلائی جارہی ہے، اسے دیکھتے ہوئے مطمئن ہو پانا مشکل ہے کہ پوسٹ کارڈ کب تک غریبوں کے لیے ریاست کے فکرمندی کی علامت بنا رہ سکے گا۔ بہرکیف پوسٹ کارڈ بھلے سستا ہو، لیکن ڈاک کی دوسری چیزوں کی قیمتیں کافی بڑھی ہیں۔ اس کا خمیازہ سب سے زیادہ کتابوں اور رسالوں کی اشاعت کو ادا کرنا پڑا ہے۔ چھوٹے رسالوں کے لیے جو ادب اور گہرے خیالات کو پیش کرتے ہیں اور اکثر ذاتی ملکیت یا کم ذرائع سے نکلتے ہیں، ٹکٹ، رجسٹری، وی. پی وغیرہ کے خرچ کو اٹھا پانا دنوں دن مشکل ہوتا جارہا ہے۔

ڈاک کے نظام پر گفتگو کے دوران ٹکٹوں کی تصویری دنیا کی یاد آنا لازمی ہے۔ دیکھنے میں چھوٹے ٹکٹ بہت سارے تاریخی واقعات اور زمانے کے اتار چڑھاؤ کی کہانی بیان کرتے ہیں۔ ڈاک ٹکٹ جب وجود میں نہیں تھا تو محصول وصولی کی مہر لگا کر کام چلایا جاتا تھا۔ کاغذ کے ڈاک ٹکٹوں کا رواج ایسٹ انڈیا کمپنی کے دورِ حکومت میں 1842 میں شروع ہوا۔ حالانکہ اس وقت یہ صرف سندھ کے علاقے کے لیے تھا۔ اس لیے وہ سندھ ڈاک کے نام سے جانا گیا۔ سندھ یا ہندستان ہی نہیں، سارے ایشیا میں یہ ڈاک ٹکٹ کا پہلا مظاہرہ تھا۔ اس ٹکٹ پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا نشان تھا۔ بعد میں پورے ہندستان کے لیے ڈاک ٹکٹ جاری کیا گیا۔ ان ٹکٹوں پر مہارانی وکٹوریہ، جارج پنجم وغیرہ کی تصاویر ان کے دورِ حکومت میں چھاپی جاتی رہیں۔ 1931 میں، جب نئی دہلی کا افتتاح ہوا تو شاید پہلی بار کچھ ٹکٹوں پر انگریز حکمرانوں کی تصاویر کی بجائے کچھ ہندستانی مناظر کی عکاسی کی گئی۔ آزاد ہندستان میں ڈاک ٹکٹ روزمرہ زندگی کی رنگارنگی کا حسن اور مختلف علاقوں کی کامیابی کی شہادت دینے کے ساتھ ہی ساتھ سیاسی، تہذیبی، تعلیمی، سائنسی شخصیات کی عزت افزائی کرنے کا ذریعہ بھی رہا ہے۔ ڈاک ٹکٹوں پر تاریخی واقعات اور دلکش شبیہوں کی وجہ سے ہی انھیں جمع کرنے کا شوق رکھنے والے ساری دنیا میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ ٹکٹ ہی جدید ڈاک نظام کا پیش خیمہ ہے۔ اس کے چلن کے برسوں بعد دوسری چیزیں وجود میں آئیں۔ مثلاً پارسل اور وی. پی. کی شروعات 1877 میں ہوئی تو پوسٹ کارڈ کی اس کے دو سال بعد 1879 میں ہوئی۔ جس طرح ڈاک ٹکٹ کی تاریخ راجاؤں کی تصاویر سے شروع ہوکر عام لوگوں اور سماجی رہنماؤں کی طرف بڑھتی ہے اسی طرح اس خدمت کا جمہوری ارتقا ہوا ہے۔ شروع میں ڈاک کا انتظام صرف راجا، مہاراجا اور سپہ سالاروں کے لیے ہوتا تھا اور اس کا مقصد خاص طور سے فوج کی روش اور ریاست میں کہیں بے اطمینانی یا بغاوت پیدا ہونے کی حالت میں اس کی جانکاری لینا تھا۔ لیکن ابھی ہم جس جدید ہندستانی ڈاک نظام کی بات کر رہے ہیں اس کا آغاز یکم اکتوبر 1854 کو ہوا تھا اور اب اس کے ڈیڑھ سو سال پورے ہوگئے ہیں۔ 1854 میں ٹیلی گراف محکمے کا بھی آغاز ہوا اور ڈاک محکمے کے جڑواں بھائی کی طرح وہ بھی ترقی کی منزلیں طے کرنے لگا۔

ہندستانی محکمۂ ڈاک صرف پیغام رسانی کا ہی ذریعہ نہیں بلکہ وہ کروڑوں لوگوں کے لیے اپنے گھر، خاندان کے افراد اور دوسرے محبوب لوگوں تک پیسہ پہنچانے کا ذریعہ بھی رہا ہے۔ 1880 میں جب منی آرڈر کی سہولت شروع ہوئی تب سے آج تک اس شکل میں محکمۂ ڈاک نے عام لوگوں کی کتنی خدمت کی ہے، اس کا تصور کرنے کے لیے اس سچائی کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے کہ ہمارے ملک میں زیادہ تر مخلوط خاندان ہیں۔ کسی ممبر کے کمانے کے لیے باہر جانے پر خاندان منی آرڈر پر ہی منحصر رہتا ہے۔ ایسے

خاندانوں کی تعداد میں لگاتار اضافہ ہوا ہے کیوں کہ گاؤں میں روزگار گھٹنے سے غیر ممالک میں کام کرنے کی مجبوری بڑھی ہے۔ اترانچل کا تو معاشی نظام کافی حد تک منی آرڈر پر منحصر ہوگیا ہے۔ معمولی حیثیت کے خاندانوں کے لیے ڈاک خانہ بچت بینک کا بھی کام کرتا رہا ہے۔ بینکوں کی ڈاک خانے کی طرح دور دراز تک پہنچ نہیں ہے۔ ملک میں بینکوں کی کل شاخیں 65ہزار ہیں جبکہ ملک بھر میں ڈاک خانوں کی کل تعداد ایک لاکھ پچاس ہزار ہے۔ ان میں سے ایک لاکھ 38 ہزار دیہاتی علاقوں میں ہیں۔

حکومتِ ہند کا یہ سب سے بڑا محکمہ اپنی خدمات کے ڈیڑھ سو سال پورے کرنے کا جشن منا رہا ہے۔ لیکن اس کے سامنے چیلنجیز بھی کم نہیں ہیں۔ Courier Agency اور دیگر ترسیلی ذرائع کے پھیلاؤ نے ڈاک محکمے کو اپنے رول پر نئے سرے سے سوچنے پر مجبور کردیا ہے۔ کوریر کا مقابلہ کرنے کے لیے ہی 1986 میں اسپیڈ پوسٹ شروع کی گئی۔ پھر 1994 میں E-post اور مصنوعی سیارے کے ذریعے منی آرڈر کی سہولت شروع ہوئی۔ حالانکہ یہ سہولیات ابھی کچھ مرکزوں پر ہی ہیں، ڈاک محکمہ انھیں زیادہ سے زیادہ شاخوں میں فراہم کرانے کی مہم میں جٹا ہے۔ پورے ڈاک نظام کو آن لائن کرنے کے لیے میسور میں واقع ٹریننگ مرکز نئے سافٹ ویئر تیار کرنے میں لگا ہے۔ ظاہر ہے، آنے والے دنوں میں محکمۂ ڈاک ویسا نہیں ہوگا جیسا آپ انھیں دیکھتے آئے ہیں۔ ای میل کے ذریعے آپ کے خطوط دور دراز کے ڈاک میں اور پھر وہاں سے فوراً آپ کے بتائے پتے پر پہنچ جائیں گے۔ اگر اپنی تحریر میں ہی خط یا کوئی دستاویز ہو بہو بھیجنا ہوگا تو اس کے لیے اسکیننگ کی بھی سہولت ہوگی۔ کہاں تو ڈاک خدمات کے کام کاج پر ہی سوالیہ نشان لگنے لگا تھا اور کہاں اس محکمے کی ایسی کایا پلٹ کرنے کی تیاری ہے کہ تمام کمپنیاں اس کی مدد مانگنے کے لیے قطار باندھے کھڑی نظر آئیں گی۔ یہ شروع بھی ہو چکا ہے UTI، ICICI, HDFC وغیرہ کچھ بینکوں نے اپنا کاروبار بڑھانے میں محکمۂ ڈاک کی مدد لینی شروع کردی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ چودہ سو کروڑ کا نقصان اٹھانے والا یہ محکمہ جلد ہی فائدے میں نظر آنے لگے۔ جدید کاری کے عمل میں اس کا نام بھی بدل گیا ہے اور اب یہ انڈیا پوسٹ (India post) ہے۔ (بشکریہ ''جن ستّا'' نئی دہلی، 7رنومبر 2004)

مترجم کا پتہ:
411, Mansarowar Hostel, Delhi U., Delhi-7

□□□

بہادری کے کارنامے

مصنف: منوج داس/مترجم: ایس ایم احمد

ہمارے ملک کو انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کے لیے لاتعداد قربانیاں دینی پڑی ہیں۔ جن سورماؤں نے اپنی جان آزادیِ وطن کے لیے نچھاور کی، ان کی ایک طویل فہرست ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں جدوجہد آزادی کے ابتدائی دور کے ایسے ہی بہادر سپوتوں کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔

صفحات: 83، قیمت: -/25 روپے

رام پرشاد بسمل کی آپ بیتی

مرتب: ڈاکٹر وشوامترا اپادھیائے/مترجم: احسان احمد صدیقی

مادرِ وطن کی آزادی کے لیے اپنی جان کی قربانی پیش کرنے والوں میں مشہور انقلابی رام پرشاد بسمل سرِفہرست ہیں۔ یہ آپ بیتی انھوں نے گورکھپور جیل میں اپنی پھانسی سے دو دن پہلے مکمل کی تھی۔ جدوجہد آزادی کے اس دور کی حقیقی تصویر کشی کے سبب یہ آپ بیتی دستاویزی اہمیت کی حامل ہے۔

صفحات: 109، قیمت -/33 روپے

سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خاں

مصنف: راجندر اوستھی/مترجم: عبدالغفار خاں

خان عبدالغفار خاں کی زندگی طوفانوں کی تاریخ ہے۔ ہندستان کی جنگِ آزادی سے لے کر پاکستان کے قیام کے بعد تک وہ پختونوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کے خلاف غریبوں اور مظلوموں کی لڑائی لڑتے رہے اور اس لڑائی میں ان کی زندگی کا بیشتر حصہ جیل میں گزرا۔ سرحدی گاندھی کے حالاتِ زندگی سے واقفیت کے لیے اس کتاب کا مطالعہ کریں۔

صفحات: 78، قیمت: -/21 روپے

تین زنگ نورگے

مصنف: درگا پرشاد شکل/مترجم: جہاں آرا

تین زنگ نورگے اور ایڈمنڈ ہلیری کوہ پیمائی کی تاریخ کے روشن باب ہیں۔ زیرِ نظر کتاب میں تین زنگ نورگے کی سوانح حیات کے ساتھ ساتھ ایورسٹ کی چوٹی سر کرنے کی مہم کی پوری تفصیل درج ہے۔

طلبہ کے لیے ایک بے حد معلوماتی کتاب۔

صفحات: 87، قیمت: -/21 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسبِ ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی

تحریر: پریا تھیان
ترجمہ: ممتاز

موبائل فون کے مفید و مضر اثرات

گھنٹوں کی بات چیت کی سہولت، وقت کے ساتھ ہم آہنگی، انٹرنیٹ کی سہولت، معروضات کا انتقال (Data Transfer)، بلیوٹوتھ (Blue Tooth)، نجی کمپیوٹروں کی دستیابی، کیمرہ، ایس.ایم.ایس.، ایم.ایم.ایس. اور ڈاؤن لوڈ کیے جاسکنے والے کھیل اور ان کے علاوہ دلکش اور حیرت انگیز وضع قطع کی مصنوعات کے سبب آج سیل فون بنانے والوں نے نہایت وسیع پیمانے پر لوگوں کو اپنے حصار میں جکڑ رکھا ہے۔ دراصل آج سبھی موزوں اور ضروری چیزیں ہینڈسیٹ 24/7 میں لگی ہوئی ہیں۔ 2006 تک یہ بھی ممکن ہے آپ ایئربس میں فضائی سفر کے دوران اپنے باس کے ساتھ کسی بھی کانفرنس کی بابت غور وفکر کرسکیں یا پھر ہنی مون کے دوران اپنی ماں کے ساتھ رابطہ بنائے رکھ سکیں۔ اس طرح کا لامتناہی سلسلۂ کلام بے حد عمدہ سہی، لیکن اس کے لیے آپ کو توقعات سے کہیں زیادہ قیمت بھی چکانی پڑ سکتی ہے۔ ذیل میں بعض اہم حقائق پیش کیے جارہے ہیں، جنھیں استعمال کرنے والوں کو جاننا ضروری ہے۔

سیل سیل کو مارتا ہے

ڈاکٹر راکیش جلالی جو Radiation oncologist کی حیثیت سے ممبئی کے ٹاٹا میموریل اسپتال سے وابستہ ہیں اور دماغی رسولی (Brain Tumour) کے ماہر طبیب ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ''سویڈن کے کیرولنسکا انسٹی ٹیوٹ کے پروفیسر الہام (Ahlbom) کے نومبر 2004 میں شائع ہونے والے ریسرچ پیپر میں یہ انکشاف کیا گیا ہے کہ ان لوگوں کے لیے acoustic neuroma (ایک benigh tumour جو صوتیاتی اور fascial muscles کو متاثر کرتا ہے) کا خطرہ دوگنا ہوجاتا ہے جو تقریباً دس برس سے سیل فون استعمال کررہے ہیں۔

سویڈن کی آریبرو یونیورسٹی (Orebro University) کے Oncology کے پروفیسر لینارٹ ہارڈویل (Lennart Hardwell) نے بھی 2001 میں یہ پایا کہ ایسے لوگوں میں ڈھائی گنا زیادہ ٹیمپرل برین ٹیومر (temporal braintumour) تھا جو سیل فون استعمال کرتے تھے۔ یہ دماغی رسولی ان کے سر کے اسی حصے میں پائی گئی جس حصے پر وہ فون لگایا کرتے تھے۔

سائنس داں جارج لوئس کارلو (George louis carlo) جن کو امریکی موبائل سازوں نے اس دعوے کی تردید کے لیے بلایا تھا کہ موبائل کینسر کا سبب ہے، کارلو نے چھ سال کی جامع تحقیق، تجزیے اور بڑے ہی غور وخوض کے بعد یہ دعوا کیا کہ سیل فون انٹینا سے نکلی شعاعیں مائیکرونیوکلیائی ریڈ فلیگس (micronuclei red flags) بناتی ہیں جن کے سبب دماغ میں کینسر کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ ان کے مطابق بچے بالغوں کی بہ نسبت ان شعاعوں کا زیادہ جلدی اثر قبول کرلیتے ہیں۔ کارلو نے اپنی اس دریافت سے انڈسٹری اور USFDA کو بھی مطلع کیا اور اس پر ریسرچ جاری رکھنے کی وکالت کی اور سیلولر فونوں کے ایسے اشتہارات پر پابندی عائد کی جائے جو نوجوانوں کو نشانہ بناتے ہیں لیکن حکام کا ماننا ہے کہ سیل فون سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔

مزید یہ کہ ڈاکٹر جلالی کا تبصرہ بعنوان Cellular phones and their hazards: The current evidence (سیلولر فون اور اس کے خطرات: حالیہ شواہد) جو ستمبر 2002 میں نیشنل میڈیکل جرنل آف انڈیا میں شائع ہوا، خبردار کرتا ہے کہ ''اگرچہ اعداد وشمار متضاد ہیں لیکن اتنی بات طے ہے کہ خطرے کا فیصد صفر نہیں ہے۔ چنانچہ عمل کی افادیت کو سامنے رکھ کر کام کرنے والے لوگ اس کا استعمال کم کرسکتے ہیں، خاص طور سے بچوں کے درمیان اور جہاں تک ممکن ہو اس کے انٹینا کو جسم سے دور ہی رکھیں اور سیل فون کمپنیوں کو بھی سیل فونوں کی ایسی ساختوں سے متعارف کرانا چاہیے جن سے برقی لہروں کا اشعاعی ارتعاش (radio frequency waves) کم سے کم باہر نکلے۔

بھیجا فرائی

اگر آپ نے دیکھا ہو کہ آپ کا بجتا ہوا سیل فون کمپیوٹر مانیٹر یا ٹی وی کے اسکرین پر کیا اثر ڈالتا ہے تو آپ یہ بھی تصور کرسکتے ہیں کہ یہ آپ کے دماغ پر کیا اثر ڈال سکتا ہے؟ ڈاکٹر روس ایڈے (Dr. Ross Adey) جو کیلی فورنیا یونیورسٹی کے بایوکیمسٹری کے شعبے میں خردی لہروں کے حیاتیاتی اثر کے ماہر ہیں، ان کے ایک مطالعے کے مطابق ''سیلولر فون خردی لہریں (microwaves) بھی پیدا کرتے ہیں اور استعمال کرنے والے کے دماغ سے سیلولر فون کا براہ راست تفاعل (interaction) بڑھنے کا امکان قوی ہوجاتا ہے۔ نیند کی حالت میں تغیر وتبدل کو دائرۂ تحقیق میں لایا گیا ہے اور سیل فون کے میدان میں لہجے کی شناخت کے دوران نصف کرۂ ارض میں EEG کے ریکارڈ میں بدلاؤ کا مشاہدہ کیا گیا ہے اور حالیہ تحقیق، جو واشنگٹن یونیورسٹی

کے ڈاکٹر نریندر سنگھ اور ہنری لائی (Henry Lai) نے چوہوں پر کی ہے، اس حقیقت کو سچ کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

سن 2004 کی رپورٹ Lowlevelmagenetic field کے سبب DNA کو ضرر پہنچنے اور دماغی خلیوں کی موت کی توثیق کرتی ہے اور مشورہ دیتی ہے کہ ایک میکنزم جس کے ذریعے لوگوں میں مختلف روبہ تنزل (degenereative) امراض، جیسے الزیمر (Alzheimer) اور پارکنسن (Parkinson) کو Magnetic field کے exposure سے وابستہ کیا جاسکتا ہے۔

امریکہ کے انسٹی ٹیوٹ آف انوائرنمنٹل ہیلتھ سرویز کے رسالے Environmental Health Perspective میں شائع ایک تحقیقی مقالے میں انکشاف کیا گیا ہے کہ ''ممکن ہے کچھ دہائیوں تک روزانہ (سیل فون) استعمال کرنے کے بعد پوری نسل متوسط عمر سے بھی کافی پہلے اس کے منفی اثرات کا شکار ہو جائے۔''

اگرچہ عالمی صحت تنظیم کا ماننا ہے کہ کسی بھی حالیہ تحقیق میں یہ بات نہیں ملتی کہ موبائل فون کی ارتعاشی اشعاعی لہریں (Radio frequency waves) یا اس کے بیس اسٹیشن (base station) کا ایکسپوز صحت پر خراب اثر ڈالتا ہے لیکن اس نے کوئی بھی حتمی بیان جاری کرنے سے قبل مزید تحقیقات کی ضرورت پر زور دیا ہے۔

دہلی کے راج ٹھکر جو سمسنگ انڈیا الیکٹرونکس لمیٹڈ میں کارپوریٹ کمیونیکیشن کے سربراہ ہیں، ان کا خیال ہے کہ عالمی صحت تنظیم سمیت بین الاقوامی سائنسی تحقیقی اداروں نے دنیا بھر میں منعقدہ پروگراموں میں کہا ہے کہ موبائل فونوں کی اشعاعی لہروں کا exposure جو بین الاقوامی ایکسپوزر گائڈ لائن کے تحت چلایا جاتا ہے کسی مسائل کا سبب نہیں۔ (The specific absorption rate) SAR نے اشعاعی لہروں کی قوت کو ناپا ہے جو موبائل استعمال کرتے وقت جسم میں داخل ہوتی ہیں۔ انٹرنیشنل کمیشن آن نان آیونائزنگ ریڈی ایشن پروٹیکشن (ICNRIP) نے عام لوگوں کے لیے SAR کی تحفظاتی دو واٹ فی کلوگرام طے کی ہے اور اسے عالمی تنظیم صحت نے بھی پاس کر دیا ہے۔

پرخطر ڈرائیونگ

2000 میں ''دی لینسیٹ'' میں شائع ایک رپورٹ میں (Massachusetts) کے سائنس داں ڈاکٹر کیلتھ روتھمین نے بتایا کہ ان کی تحقیق سے اس طرح کے اشارے ملتے ہیں کہ ڈرائیور کے کار چلاتے ہوئے فون استعمال کرنے سے یا کسی کال کے فوراً بعد حادثے کے امکانات چار گنا زیادہ بڑھ جاتے ہیں اور جو لوگ موبائل کا زیادہ استعمال کرتے ہیں ان لوگوں کے مقابلے میں دوگنا زیادہ تباہ کن سڑک حادثوں کا شکار ہوتے ہیں جو موبائل فون کم استعمال کرتے ہیں مزید یہ کہ ہینڈس فری (Hands free) کانوں سے فون لگا کر استعمال کیے جانے والے ہینڈ سیٹ سے کم خطرناک نہیں ہیں کیوں کہ دونوں ہی صورتوں میں استعمال کرنے والے کی توجہ میں خلل واقع ہوتا ہے۔

مادۂ تولید میں کمی

2004 میں خبر رساں ایجنسی رائٹر کے مطابق ہنگری کے سائنس دانوں نے ایک سروے سے جو نتائج اخذ کیے ہیں ان کی روشنی میں یہ دعوا کیا ہے کہ جو لوگ پینٹ کی جیب میں کمر میں کھونس کر موبائل رکھتے ہیں ان کے مادۂ تولید میں 30 فی صد کی کمی واقع ہو جاتی ہے۔ ''طویل عرصے تک سیل فون کا استعمال مادۂ تولید کی پیداوار (Sperm production) اور قوت مردانگی (Male fertility) پر منفی اثر ڈالتا ہے۔''

Szeged یونیورسٹی کے وضع حمل اور نسوانی امراض سے متعلق شعبے کے ڈاکٹر امرے فیجس نے اپنے مطالعے کا لب لباب اس طرح پیش کیا ہے۔ جبکہ ڈچ پروفیسر اور یوروپین سوسائٹی آف ہیومن ریپروڈکشن اینڈ ایمبریولوجی (European Society of Human Reproduction & Embrology) کے صدر ہینس ایورس کا دعوا ہے کہ نتائج گو کہ دلچسپ ہیں لیکن کسی بھی قطعی فیصلے سے بہت دور ہیں کیونکہ ان میں مضمر امدادی حقائق جیسے سگریٹ نوشی اور دباؤ وغیرہ کو شامل نہیں کیا گیا ہے۔ برطانیہ کا قومی اشعاعی تحفظاتی بورڈ (Britein's National Radiological Protection Board) جو موبائل فون اور اشعاعی ارتعاشی لہروں کے صحت پر پڑنے والے اثرات پر اپنا تحقیقی تبصرہ پیش کر چکی ہے اس نے کہا ہے کہ یہ کہنا بے محل لگتا ہے کہ لہریں ظاہر ہونے کے باوجود محفوظ ثابت ہوتی ہیں۔

خطرناک

پٹرول پمپوں یا کسی بھی ایسی جگہ جہاں ایندھن بھرا جاتا ہے وہاں سیلولر فون کا استعمال پر خطر ہوتا ہے دراصل سیل فونوں کے سوئچ اور ہائی پاور کی بیٹریاں چنگاریاں پیدا کر سکتی ہیں جو دھماکوں کا سبب بن سکتی ہیں۔ گیس اسٹیشنوں میں الیکٹرونک آلات کو زیادہ تر دھماکوں سے بچائے رکھنے کے لیے محفوظ کر دیا جاتا ہے جبکہ سیل فون نہیں رکھے جاتے گرچہ سیل فونوں سے خطرہ کم رہتا ہے، لیکن بنا رہتا ہے۔ چنانچہ جب آپ ایندھن بھروا رہے ہوں تو اپنے سیل فون کو اس وقت تک بند رکھیں جب تک ایندھن بھروا نہیں لیتے اور آپ کی کار اس جگہ سے دور نہیں نکل جاتی۔

(بشکریہ ''ٹائمس آف انڈیا'' نئی دہلی، 31 اکتوبر 2004)

مترجم کا پتہ:
H.No. 993, Gali Rajan,
Farash Khana, Delhi-6

□□□

محمد عبدالباسط

ان پیج اردو — اردو کے لیے ایک مکمل سافٹ ویئر

اردو زبان نہ صرف لکھنے پڑھنے اور سننے میں مترنم و شیریں لگتی ہے بلکہ بہت موثر بھی ہے۔ یہ زبان دیکھنے اور لکھنے میں بھی بہت خوبصورت اور نازک معلوم ہوتی ہے۔ اس بات کو غیر اردو داں بھی محسوس کرتے ہیں۔ اردو کتابت کا رواج بہت قدیم زمانے سے چلتا آرہا ہے۔ جب سے اردو زبان نے جنم لیا ہے تب سے آج تک اردو کتابت کی اہمیت برقرار ہے۔ قدیم زمانے میں حاکموں، تاجروں، صوفیوں اور علما، ادبا و شعرا، نے اردو کتابت کے ذریعے اپنے خطوط و مراسلے ایک دوسرے کو بھیجا کرتے تھے۔ لیکن اس ترقی یافتہ ٹیکنالوجی کے دور میں ہم دیکھتے ہیں کہ مراسلتی کاموں میں ایک نیا انقلاب آگیا ہے جس کا نام انٹرنیٹ ہے۔ ٹیکنالوجی کی دنیا سے جڑے رہنے والوں کی یہ خواہش تھی کہ اردو کتابت جیسے عظیم فن کو ٹیکنالوجی سے جوڑ دیں اور اردو خط و کتابت کا کام کمپیوٹر کے ذریعے انجام دیں۔ 20 سال بعد سخت محنت اور مشقت کے بعد اس دیرینہ خواب کی تعبیر "ان پیج اردو" کی شکل میں سامنے آئی جو کتابت کی تمام تر خصوصیات اور جدید تکنیکی سہولتوں سے آراستہ ہے۔

"ان پیج اردو" 1995 میں منظرِ عام پر آیا اور اس سافٹ ویئر کو تیار کرنے والی ہندستان کی مشہور سافٹ ویئر ڈیولپنگ کمپنی Concept Software Ltd. New Delhi ہے۔ "ان پیج اردو" تیار کرنے والوں میں سب سے پہلا نام فیروز ہاشمی اور ان کے دیگر ساتھیوں کا لیا جاتا ہے۔ "ان پیج اردو" ایک مکمل پیج لے آؤٹ سافٹ ویئر پیکیج ہے۔ اس سافٹ ویئر میں اردو کتابت کے تمام اصولوں کا خیال رکھا گیا ہے۔ اس سافٹ ویئر میں خطِ نستعلیق کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ اگر ہم غور کریں تو خطِ نستعلیق کی بناوٹ و ساخت دنیا کی دوسری زبانوں سے بالکل مختلف ہے۔ کسی بھی زبان میں ایسے خطوط کم ہیں جن کے جوڑ اوپر کی طرف بڑھتے جاتے ہوں۔ خطِ نستعلیق میں ایک حرف دوسرے حرف سے ملانے کے بعد مائل میں سے تیس ڈگری کے مابین اوپر کی طرف بڑھتا ہے، کسی بھی زبان کے اسکرپٹ کو سافٹ ویئر میں ڈالنے کے لیے دو صورتوں کا استعمال ہوتا ہے۔ ایک کیرکٹر (Character) دوسرا لگیچر (Ligature)۔

ان پیج اردو میں تمام حروفِ تہجی کے علاوہ اردو کے اعراب، حرکات و سکنات، اشارے اور نشانات پائے جاتے ہیں۔ اس سافٹ ویئر کے ایڈوانس ورژن 2.62 میں جملہ آٹھ قسم کے کی بورڈ دستیاب ہیں۔ جو مونو ٹائپ، آفتاب، مقتدا، فینوٹک، پرشین، عربک، کشمیری اور کردش کے نام سے موجود ہیں۔ اس کے علاوہ یوزر ڈیفائن کی بورڈس بھی ملتے ہیں۔ حسب بالا میں سب سے زیادہ عام استعمال ہونے والا کی بورڈ فینوٹک ہے۔ یہ کی بورڈ یاد رکھنے اور استعمال کرنے کے لیے بہت آسان سہولت فراہم کرتا ہے۔ فینوٹک کی بورڈ میں اردو زبان کے حروفِ تہجی، اعراب، حرکات و سکنات کو بہت مخصوص انداز میں انگریزی حروفِ تہجی، حرکات و سکنات کے ساتھ منسلک کردیا گیا ہے۔ مثلاً الف کے لیے 'a'، ب کے 'b'، ت، ٹ کے لیے 't'، 'T' اور زیر، زبر، پیش کے لیے 'P', <, >' وغیرہ ہیں۔ جب کہ یوزر ڈیفائن کی بورڈ کا مقصد یہ ہے کہ یوزر اپنا مطلوبہ کی بورڈ تیار کرسکتا ہے۔ پھر بھی تیار کردہ کی بورڈ فینوٹک کے مماثل سہولت فراہم کرنا مشکل ہے۔

ان پیج اردو سافٹ ویئر کو کمپیوٹر پر چلانے کے لیے ہمیں ہارڈ ویئر اور سافٹ ویئر کی ضروریات کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے۔ جیسے اس سافٹ ویئر کو چلانے کے لیے کم سے کم ہارڈ ویئر آئی بی ایم پی سی 486 یا اس سے بھی زائد، 8 ایم بی RAM اور 25 ایم بی فری ہارڈ سک میموری VGA مانیٹر اور ایک ڈونگل یعنی یہ ایک طرح کا سافٹ ویئر لاک (قفل) ہارڈ ویئر پارٹ ہے جس کے دو رخ ہوتے ہیں جس کا پہلا سرا CPU کے Paralell Port سے منسلک کردیا جاتا ہے اور دوسرا سرا پرنٹر کیبل کے ساتھ جوڑ دیا جاتا ہے۔ ڈونگل کو محض "ان پیج اردو" چلانے کے لیے تیار کیا گیا اس لیے اس ہارڈ ویئر کا لگانا نہایت ضروری ہے۔ لیکن آج نئے ورژن جیسے 2.62 کے لیے ڈونگل کے بجائے Software Key Number تیار کیا گیا ہے۔ "ان پیج اردو" کے مکمل انسٹالیشن کے اختتام پر سافٹ ویئر نمبر ٹائپ کردینے سے "ان پیج اردو" کام کرنے لگتا ہے۔

ان پیج اردو کو چلانے کے لیے ونڈوز کم سے کم ورژن 3.11 یا اس سے بھی زائد آپریٹنگ سسٹم سافٹ ویئر ضروری ہے۔

ان پیج اردو کو ہندستان میں سب سے پہلے ربانی بک سینٹر، دہلی نے استعمال کیا اور اخبارات کے میدان میں سب سے پہلے استعمال کرنے والا ممبئی سے شائع ہونے والا روزنامہ "انقلاب" ہے۔ ان اداروں نے اس سافٹ ویئر کو استعمال کیا اور کامیاب قرار دیا۔ اس سے اس سافٹ ویئر کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔

اس سافٹ ویئر کے پرانے ورژن میں جو بھی کمیاں، خامیاں پائی گئیں۔ انھیں جدید ورژن میں دور کردیا گیا۔ 1995 سے اب تک ان پیج اردو کے مختلف ورژن تیار کیے گئے جیسے Inpage 1.5, 1.6, 2.0, 2.3 ,1.0, 1.1 اور آج Inpage 2.62 دستیاب ہے۔ اس ورژن میں خط نوری نستعلیق میں زبردست نکھار، متن میں ہونے والی غلطیوں کے لیے اسپیل چیکر مزید فونٹس اسٹائل اور مزید کلپس، آؤٹ لائن ٹیکسٹ، خودکار کشیدہ، متن کا خودبخود اسکرول ہونا مزید بارڈرس اسٹائل، لنکنگ اَن لنکنگ باکس، پالیگون ٹول وغیرہ جدید سہولیات موجود ہیں۔

Inpage 2.62 کا گرافیکل انٹرفیس قابلِ ذکر ہے جیسے ہی ہم اس سافٹ ویئر میں داخل ہوں گے۔ اس کی ابتدائی اسکرین پر ان پیج انٹرفیس ظاہر ہوگا۔ یعنی ٹوگل بٹن، ٹولس، ربن، اسٹیٹس بار، رولرس، ڈاکومنٹ ایریا اور اسکرول بار وغیرہ۔

ٹوگل بٹن:

اس سافٹ ویئر میں جملہ چار قسم کے Language Buttons اسکرین کے نیچے دائیں جانب اسٹیٹس بار میں ظاہر ہوتے ہیں جن کو ٹوگل بٹن کہتے ہیں۔ 1- اردو انٹری بٹن، 2- سندھی انٹری بٹن، 3- پشتو انٹری بٹن، 4- انگریزی انٹری بٹن۔ یہ بٹنس تبادلۂ زبان کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ جس بٹن کا انتخاب کیا جائے اُس زبان میں متن تیار ہوتا ہے۔

ٹولس:

ان پیج اردو میں جملہ 15 ٹولس پائے جاتے ہیں۔ جن کو چار حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں تین ٹولس انفرادی خصوصیت رکھتے ہیں۔ جن کے نام (آرو ٹول، آئی بیم ٹول، روٹیٹ ٹول)، دوسرے حصے میں ٹیکسٹ باکس، ٹائٹل ٹیکسٹ باکس، ٹیکسٹ باکس، لنکنگ اور اَن لنکنگ باکس ہوتے ہیں۔ تیسرے حصّے میں پکچر باکس ٹول ہیں۔ یہ تین قسم کے ہوتے ہیں۔ آخری چوتھے حصے میں گرافکس ٹول پائے جاتے ہیں۔ یہ جملہ پانچ قسم کے ہوتے ہیں۔ اس طرح ٹولس پر منحصر 6 ربن ظاہر ہوتے ہیں۔ ٹول کے انتخاب کی بنیاد پر یہ ربن خود بخود ظاہر ہوتے ہیں۔

1- متن کی ضروریاتی ربن (Text Attribute Ribbon):

یہ ربن آئی بیم ٹول کے انتخاب پر ظاہر ہوتا ہے۔ اس ربن کا استعمال سلیکٹ کیے گئے متن کی مکمل فارمیٹنگ کے لیے ہوتا ہے فارمیٹنگ دو طرح کی ہوتی ہے۔ کیریکٹر فارمیٹنگ اور پیراگراف فارمیٹنگ۔ یعنی کیریکٹر فارمیٹنگ کے لیے Font Style, Font Size, Font Color, Italic Text, Bold Text, Underline, Pattern & Reverse Text, وغیرہ اور پیراگراف فارمیٹنگ کے لیے Alignments, Indents, Line Spacing, Inter line Gap اور رن اراؤنڈ وغیرہ تبدیل کرنا ٹیکسٹ فارمیٹنگ کہلاتا ہے۔

2- آبجیکٹ کی ضروریاتی ربن (Object Attribute Ribbon):

یہ ربن پکچر باکس آبجیکٹ، ٹیکسٹ باکس آبجیکٹ اور گرافک باکس آبجیکٹ، ان تینوں قسم کے آبجیکٹس کے انتخاب کرنے پر ظاہر ہوتا ہے اور سلیکٹ کیے گئے آبجیکٹ پر استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسے آبجیکٹ کی Position, Width, Height, Border Color, Border Thickness, Fill Color, Change Shape, Inside Border, Outside Border, Rotate, تبدیل کرنا اور ٹیکسٹ ربن کے لیے Change Shape کے بدلے ٹیکسٹ باکس میں کالموں کی تعداد، کالموں کا درمیانی فاصلہ متعین کرنا وغیرہ آبجیکٹس کی ضروریات ہیں۔

3- پکچر ایڈیٹنگ ربن (Picture Editing Ribbon):

دستاویز میں پکچر داخل کرنے پر یہ ربن ظاہر ہوتا ہے اور پکچر کی Position, Height, Width, Contrast, Brightness, Fliping, اور Picture Rotate تبدیل کرنے میں مدد کرتا ہے۔ جسے پکچر ایڈیٹنگ کہتے ہیں۔

4- اِن لائن گرافک ربن (Inline Graphic Ribbon):

لائن کے انتخاب کرنے پر یہ ربن ظاہر ہوتا ہے۔ یہ ربن مخصوص طور پر Line کے لیے مہیا کیا گیا ہے۔ جس کی مدد سے لائن کی Position, Width, Color, Fill Color, Rotate اور لائن Thickness وغیرہ تبدیل کرسکتے ہیں۔

5- ٹیبس ربن (Tabs Ribbon):

یہ ربن متن کے لیے Tab سیٹ کرنے او رپیراگراف کے لیے Indents سیٹ کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جس میں چار قسم کے Tab Alignments اور پیراگراف کے لیے تین Indents دستیاب ہیں۔

6- پیسٹ ربن (Paste Ribbon):

یہ ربن Cut یا Copy کیے گئے آبجیکٹ کو مخصوص مقام پر پیسٹ کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

اسٹیٹس بار:

اسٹیٹس بار کو تین حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ (i)- جائزہ، (ii)- پیج اسکرول، اور (iii)- ماسٹر پیج۔

(i)- جائزہ (View): جائزہ صفحے کا مطلوبہ View متعین کرنے کے لیے

استعمال ہوتا ہے۔ دستاویزی صفحات کا جائزہ کم سے کم 1% اور زیادہ سے زیادہ 300% میں دیکھا جاسکتا ہے۔

(ii)- پیج اسکرول (Page Scroll): دستاویز میں رہنے والے اگلے اور پچھلے صفحات پر پہنچنے کے لیے پیج اسکرول کا استعمال کیا جاتا ہے۔

(iii)- ماسٹر پیج (Master Page): ماسٹر پیج ''ان پیج اردو'' میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ماسٹر پیج کی مدد سے کتاب کے لیے ہیڈر، فوٹر اور صفحہ نمبر تیار کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ یا یوں سمجھیے ماسٹر پیج میں کی گئی تبدیلی خودبخود دستاویز کے ہر صفحے میں ظاہر ہوتی ہے۔ اور یہ تبدیلی صرف ٹائٹل ٹیکسٹ باکس کی مدد سے کی جاتی ہے نہ کہ ٹیکسٹ باکس کے ذریعے۔

رولرس (Rulers):

رولرس دو طرح کے ہوتے ہیں۔ عمودی اور افقی رولرس جن کی مدد سے تیار کیے گئے آبجیکٹ کا معائنہ کیا جاتا ہے۔ یہ رولرس کا علاقہ دستاویز میں آبجیکٹ کو Align کرنے کے لیے گائیڈ لائن لینے میں مدد دیتا ہے۔

اوریجن باکس (Origin Box):

اوریجن باکس عمودی اور افقی رولر کے آغاز میں پایا جاتا ہے جسے کھینچ کر اپنے معین صفحے کے سائز کی اصلی پوزیشن کراس کرسر سے متعین کرسکتے ہیں یا اوریجن باکس کا استعمال دستاویزی صفحات پر اسکیلنگ معین کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔

اسکرول بار (Scroll Bar):

دستاویزی صفحات کو دائیں بائیں اوپر نیچے کی جانب Scroll کرنے کے لیے اسکرول بارس کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اسکرول بار دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک عمودی اور دوسرا افقی۔

دستاویز (Document Area):

ڈوکومنٹ ایریا اُسے کہتے ہیں جہاں ہم مختلف قسم کے آبجیکٹ، متن وغیرہ تیار کرسکتے ہیں۔ دستاویز کے لیے مختلف قسم کے صفحات منتخب کرسکتے ہیں۔ جیسے Letter, Legal, Custom, A4 وغیرہ۔ جس کے اطراف پیسٹ بورڈ ظاہر ہوتا ہے۔ اس میں وقتی طور پر آبجیکٹ کو رکھا جاتا ہے اور ضرورت پڑنے پر دستاویز میں لیا جاتا ہے۔ پیسٹ بورڈ پر رکھے گئے آبجیکٹ کو ہر صفحے پر ظاہر کرتا ہے۔

مینو (Menu):

ان پیج اردو کے جدید ورژن 2.62 میں جملہ 10 مین مینو پائے جاتے ہیں۔
File, Edit, View, Format, Insert, Symbol, Utilities, Language, Windows, Help وغیرہ ہیں۔ جن کے Sub Menus کے ساتھ کی بورڈ شارٹ کٹ بھی دستیاب ہیں۔ اس سافٹ ویئر کو رفتار کے ساتھ چلانے کے لیے جملہ 121 کی بورڈ شارٹ کٹس اور ماؤس شارٹ کٹس تیار کیے گئے ہیں۔ جو کرسر موومنٹ، ٹیکسٹ ایڈیٹنگ، ٹیکسٹ فارمیٹنگ، پیج ایڈیٹنگ، پیج موومنٹ، پیج کی تبدیلی، آبجیکٹ ایڈیٹنگ، پکچر ایڈیٹنگ، ویو کی تبدیلی، فائل آپریشن اور ٹول سلیکشن وغیرہ کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ آپریٹرس ان کی مدد سے اپنے کام کو رفتار کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔ اس لیے ڈی.ٹی. پی. آپریٹنگ میں شارٹ کٹس کے استعمال کو بہت ترجیح دی گئی ہے۔

ان پیج اردو کا دائرۂ استعمال بہت وسیع ہے جن میں روزنامہ پاکستان، روزنامہ جنگ، نوائے وقت، (پاکستان)، دی نیشن، اخبار وطن (انگلینڈ)، روزنامہ پاکیزہ، ٹورنٹو (کناڈا)، ماہ نامہ رسالہ اردو دنیا، ہفت وارنئی دنیا، قومی آواز، عوام، سب کا اخبار، ان دنوں (دہلی)، روزنامہ انقلاب (ممبئی)، روزنامہ منصف، سیاست، ہمارا عوام (حیدرآباد)، روزنامہ سلطان دکن، پاسبان، سالار (بنگلور)، روزنامہ اردو ایکشن، ندیم (بھوپال)، سری ٹائمز (سری نگر)، قومی تنظیم، انقلاب جدید، خدا بخش لائبریری جرنل (پٹنہ)، رضا لائبریری (رامپور) پی ایم ہاؤس، راجیہ سبھا، لوک سبھا، اردو پبلی کیشنز ڈویژن، یو پی انفارمیشن سنٹر، جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ اردو علی گڑھ، پاکستان ہائی کمیشن، ایرانی کلچر ہاؤس، عالمی اردو کانفرنس، ڈی اے وی پی، دہلی یونیورسٹی، جمعیۃ علماء ہند، دارالعلوم دیوبند، ریڈکراس سوسائٹی، اردو گھر، ایوان غالب، بی بی سی اور ہندستان کی سبھی اردو اکادمیاں اور انجمنیں اسی سافٹ ویئر کی مرہون منت ہیں۔

اس سافٹ ویئر کی ایجاد نے ہندستان بھر میں سارے اردو طبقات کو متاثر کیا ہے اور نئے پڑھنے لکھنے والوں میں دلچسپی کا باعث بھی بنا ہے اور پبلشنگ سنٹرس کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کیا ہے۔

اور سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ اس سافٹ ویئر نے اردو زبان کو فروغ دینے میں بہت بڑا کردار ادا کیا ہے۔ 1999 میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ہندستان بھر میں کمپیوٹر اور کیلی گرافی ٹریننگ سینٹر قائم کرکے یہ ثابت کردیا ہے کہ اردو زبان میں کتنے ہی مشاعرے، سمینار منعقد کیوں نہ ہوں لیکن جب تک یہ زبان آج کی ٹیکنالوجی سے نہ جڑ جائے تب تک اس کا فروغ مشکل ہے۔ آج اردو زبان کے فروغ کے لیے اتنا کہنا کافی ہے کہ یہ زبان آج دنیا کے بیشتر ممالک میں بولی اور سنی جاتی ہے۔

□□□

H.No. 110, M.B. Nagar,
Near Childrens Garden,
Ring Road, Gulbarga-4

تحریر: مدن گوپال
ترجمہ: فاخر شبیر عباسی

سکندر اعظم کا حملہ

ہندستان کے شمال مغربی علاقے پر، جو اس وقت ایرانی حکومت کا ایک حصہ تھا، سکندر کے حملے کو اکثر مورخین، نہ صرف ہندستان بلکہ یورپ کی تاریخ کا ایک عہد آفریں واقعہ تسلیم کرتے ہیں اور اس عہد آخر میں واقعے کی اہمیت ایسی تھی کہ اس نے سکندر کو ایک ایسی عظیم شخصیت بنا دیا جس کی دنیا کی تحریری تاریخ کے ہر بڑے جنرل نے تقلید کرنے کی کوشش کی۔ اس کے اندر، دوسروں سے کہیں زیادہ، کردار کے نشوونما اور ارتقا کے ایسے راز پوشیدہ تھے جس نے اسے دوسروں کے لیے ایک نمونہ بنا دیا تھا۔

یہ بحث کہ یہ واقعہ ہندستان اور یونان کے درمیان پہلے رابطے کا باعث تھا اور یہ بھی کہ اس نے یورپ کے لیے ہندستان کے راستے کھولے تھے، ثبوتوں سے درست نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ ہندستان اور یونان کے درمیان تعلقات سکندر سے دو صدی قبل ہی قائم ہو چکے تھے۔ یہاں تک کہ جاتک کہانیوں میں ہندستانی سوداگروں کے طویل بحری سفرناموں کا ذکر ملتا ہے۔

پائیتھاگورس (Pythagoras) نے، جو 432 ق م۔ میں پیدا ہوا تھا، ایک اطلاع کے مطابق علم کی تلاش میں ہندستان تک کا طویل سفر کیا تھا، بقول ایچ۔جی۔ رانسن (H.G. Rawtinson)، ''پائیتھاگورس کے ذریعے، بتائے گئے مذہبی، فلسفیانہ اور ریاضیاتی، تقریباً سبھی نظریات چھٹی صدی قبل مسیح ہندستان میں موجود تھے۔ یونانی کتابیں یونان میں ہندستانی فلسفیوں کی موجودگی کا ذکر کرتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سقراط کے شاگرد افلاطون کی تخلیقات اور ہندستانی فلسفے کے درمیان مماثلتیں محض اتفاقات نہیں ہیں۔

سکندر سے بہت پہلے، ایران کے دیریس (Darius) کے حملے نے ہندستان اور لیوانت (بحر روم کا مشرقی ساحل) کے درمیان ایک نئے قسم کا تعلق قائم کر دیا تھا۔ Dionysus کے مقلدین جو مشرقی معرکوں میں اس کے ساتھ آئے تھے، شمالی ہندستان میں ایک جگہ پر بس گئے جسے یونانی نیسو (Nyso) کہتے تھے۔ یونانیوں نے مگدھ جیسی ہندستانی ریاستوں میں ملازمتیں حاصل کر لیں۔ ہندستانی تیراندازوں نے بھی، ایرانی جھنڈے کے تلے یونانیوں کے خلاف لڑائی کی تھی۔ لیوانت اور شمالی علاقوں میں ہندستانی تلواروں کا استعمال ہوتا تھا۔ تلوار کے لیے قدیم عربی لفظ ''مہند'' آج بھی مستعمل ہے، جس کا مطلب ہے ہندستان یا ہند میں بنی ہوئی تلوار۔

دیریس (486-533 ق م۔) نے اپنے ایک یونانی ملازم کاریانڈا (Caryanda) کے سائلیکس (Scylax) کو ہندستان کے ایک بحری راستے کی دریافت کے لیے بھیجا۔ سائلیکس نے پہلے خشکی کے راستے سفر کیا اور پھر بحر احمر کے ساحلوں کے ساتھ سندھ اور اس سے آگے تک پہنچا۔ اس کے اس پورے سفر میں ڈھائی سال کا عرصہ لگا جو مانسون کے دوران ایک بندرگاہ سے دوسرے تک جہاز رانی کرنے پر منحصر تھا۔ بہرحال، بحر احمر کے ذریعے ہندستان کے ایک بحری راستے کی دریافت ہوئی۔ یہ بھی ایک قابل غور بات ہے کہ دیریس نے ایک کے بعد ایک سندھ علاقے کے حصوں کو فتح کیا اور اسے اور گندھار کو اپنی حکومت کے بیس حصوں میں شامل کر لیا۔ ہیروڈوٹس ("Herodotus" 454-425 ق م۔) کے مطابق، دیریس کی حکومت کے مشرقی حصے میں رہنے والے ہندستانی 360 ٹیلنٹ (قدیم زمانے کا ایک وزن) سونے کا کثیر سالانہ خراج دیتے تھے۔

ہیروڈوٹس تفصیل کے ساتھ یہ وضاحت کرتا ہے کہ بعد میں کس طرح سے اکثر یونانی شہروں نے ایرانیوں سے دوبارہ آزادی حاصل کر لی تھی۔ وہ ایرانیوں کی کمزوری پر زور دیتا ہے۔ اس نے یونانیوں کو متحد ہونے اور ایران پر حملہ کرنے کے لیے جو کچھ بھی لکھا اسے جدید اصطلاح میں پروپیگنڈا کہا جا سکتا ہے۔ اسے ہیروڈوٹس نے اپنی ایک خوبی بنا لیا تھا اور وہ بہادروں سے کہتا تھا ''یہ بربری (ایرانی) لڑائی کرنے میں دلیر نہیں ہیں جبکہ دوسری طرف تم نے اب جنگ میں کافی مہارت حاصل کر لی ہے۔ ان کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ دوسرے کسی ملک کے پاس نہیں ہے جیسے سونا، چاندی، تانبا، زرنگار کپڑے، جانور اور غلام وغیرہ۔ اگر تم چاہو، تو یہ تمام چیزیں حاصل کر سکتے ہو۔''

اور یونانی اتحاد نے ژرسیس (Xerxes) کی قیادت والی ایرانی فوج پر فتح حاصل کی، جس میں ہندستانی فوج بھی شامل تھی جو گھوڑوں اور رتھوں پر سوار تھی۔ یونانی فوجی دستے نے، جو سائز میں بہت چھوٹا تھا، Salamis خلیج میں ژرسیس کے فوجی دستے پر دھاوا بول دیا۔ ژرسیس کی فوج کا ایک بڑا حصہ برباد ہو گیا اور جب ژرسیس نے دیکھا کہ اس کا اور اس کی فوج کا سلسلہ رسد

سے ٹوٹ گیا ہے تو وہ افراتفری میں ایشیائے کوچک کی طرف بھاگا۔ اس کی باقی ماندہ فوج کو 479ق.م. میں پلاٹو میں نیست و نابود کردیا گیا اور ایشیائے کوچک میں موجود فوج کو Mycale میں ختم کردیا گیا۔ اس کے بعد ایرانی خیمے میں ایک بغاوت نے سر ابھارا۔ ژرسیس کو 465ق.م. میں قتل کردیا گیا۔ بغاوت مصر اور شام تک پھیل گئی، ایرانی حکومت تاراج ہوگئی اور اس کے ڈھیر پر اگلی ڈیڑھ صدیوں میں یونانی تمدن کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد کے دنوں میں یونان اور مکدونیا کے درمیان دشمنی ہوگئی۔ 338ق.م. میں مکدونیا کا ظہور ہوا۔ اس وقت کی ایک غیر معمولی شخصیت مکدونیا کے فلپ (Phillip) کی تھی جس نے نئے سرے سے اپنی فوج کی تشکیل کی تھی۔ اس نے گھوڑے کے ذریعے کھینچے جانے والے رتھ کو، جو اس وقت تک لڑائیوں میں ایک فیصلہ کن جز سمجھا جاتا تھا، مکدونیائی فوجی دستے سے تبدیل کردیا جو پوری طرح سے مسلح گھوڑ سوار ہوتے تھے جنھیں دشمنوں کے سواروں سے نپٹنے کے لیے ترتیب دیا جاتا تھا، جبکہ پیادہ فوج دشمن کی پیدل فوج کی صفوں پر پہلو سے اور پیچھے کی طرف سے حملہ کرتی تھی۔

فلپ ایک متحرک رہنما تھا۔ 338ق.م. تک اس نے اپنی حکومت کو پورے یونان میں پھیلا دیا تھا۔ اس کا بیٹا سکندر، جو اس وقت صرف 18 برس کا تھا کیرونیا(Charonia) کی لڑائی میں پیدل فوج کا سپہ سالار تھا۔ دو برسوں کے بعد یونانی ریاستوں نے فلپ کو یونانی۔مکدونیائی اجتماعی حکومت کا جرنیل اعلا مقرر کردیا۔ حالانکہ، اس کی ملکہ اولمپس (Olympias) نے، جو ایک دوسری عورت کی وجہ سے جسے فلپ نے اپنی دوسری بیوی بنالیا تھا، اس سے حسد رکھتی تھی، فلپ کو قتل کروادیا جس کے بعد اس کا بیٹا سکندر 336ق.م. میں اس کا جانشیں بنا۔ اپنی طاقت کو مستحکم کرنے کے بعد، جس میں اسے دو برس لگے، وہ 30,000 پیدل فوج اور 5000 سوار فوج کے ساتھ ایرانیوں کے خلاف ایک معرکے کے لیے روانہ ہوا۔ اس نے پورے ایشیائے کوچک، فونیشیا (Phoenecia) اور مصر کو زیرنگیں کیا، مشہور شہر سکندریہ بسایا اور دجلہ کے ساحلوں پر دوبارا منظم ہونے والی ایرانی فوجوں کو مغلوب کرنے کے لیے آگے بڑھا۔ پھر وہ بحرخوارزم کے جنوب میں مشرق کی طرف بڑھا اور ہرکینیا (Hyrcania)، بیکٹریا (Bactria)، اور پھر آکسس (Oxus) اور سردریا (Syrdarya) پر حملہ کیا اور انھیں فتح کیا۔ Seythians اسے دھوکہ دے کر بچ نکلے اور اب وہ ذیلی سوات گھاٹی کے ذریعے جنوب کی طرف سے ہندستان میں داخل ہوا۔ اس کا پہلا نشانہ ٹکشلا تھا جو کہ تجارت کا ایک اہم مرکز تھا لیکن اس کی فوجی قدر و قیمت زیادہ نہیں تھی۔

سکندر کے معرکے کا سب سے عظیم کارنامہ، جس کا ذکر اکثر ہوتا ہے، وہ ہے آرنس (Aornos) پر اس کا قبضہ جو کہ سندھ کا ایک عظیم پہاڑی سلسلہ ہے، جس پر یہاں تک کہ ہرکولس (Hircules) بھی قابض نہیں ہوسکا تھا۔ اس تک پہنچنے کا صرف ایک ہی راستہ تھا اور سکندر نے خود اپنے آدمیوں کے ساتھ مل کر اس تنگ وادی کو بھرنے کا کام کیا جو منزل کے راستے میں حائل تھی۔ وہاں پر ایک خونریز لڑائی ہوئی جس میں سکندر نے جیت حاصل کی اور اس نے خاص قربانیاں پیش کیں۔

اپنی آگے کی پیش قدمی کے دوران اسے معلوم ہوا کہ نیسا نام کی ایک جگہ میں بسنے والے لوگ یونانیوں کے اقربا۔'' قرب و جوار میں کشادگی سے پھیلی ہوئی انگور اور عشق پیچاں کی بیلیں جو Dionysus کے لیے متبرک تھیں، اور جگہوں کے مختلف ناموں جیسے نیسا اور میرو کی بنا پر اس کہانی کی حقیقت کا اندازہ ہوا اور یونانیوں نے اپنے پرانے عزیز و اقربا کے ساتھ چند دن چھٹیوں میں گزارے۔'' اور جس وقت سکندر نے نیسا کو خیرباد کہا، 300 نیسائی سوار اس کے ساتھ ہولیے جو پورے ہندستان کے معرکے کے دوران اس کے ساتھ رہے۔

سکندر نے اٹک سے 25 کلومیٹر دور اور ہند میں سندھ کو عبور کیا۔ وہ ٹکشلا کی طرف بڑھا۔ لیکن یہ سفر مکمل طور سے آسان نہیں تھا۔ جیسا کہ Plutarch کہتا ہے،'' ہندستان کے بہترین سپاہیوں نے، جو ٹکشلا کے قریب مختلف شہروں کی حفاظت پر مامور تھے، ان کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کیں اور اتنی بہادری کا مظاہرہ کیا کہ انھوں نے سکندر کو ایک بڑی مشکل میں ڈال دیا۔ یہاں تک کہ آخر میں اس جگہ کو چھوڑ دینے کے ایک معاہدے کے بعد جب وہ لوگ واپس لوٹ رہے تھے، وہ ان پر ٹوٹ پڑا اور ان سب کو تہ تیغ کردیا۔ یہ قانون شکنی جنگوں میں حاصل ہونے والی اس کی کامیابیوں پر ایک بدنما دھبہ تھی۔'' مزید یہ کہ سکندر ہندستانی فلسفیوں کے اقدام سے ذرا بھی مشتعل نہیں ہوا جنھوں نے ان شہزادوں کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا تھا جو اس کی پارٹی میں شامل ہوگئے تھے اور آزاد حکومتوں سے التجا کی تھی کہ اس کی مخالفت کریں۔ اپنی روانگی سے قبل سکندر پیشہ ور جنگجوؤں کو اپنے پیچھے چھوڑ جانے کی غلطی نہیں کرسکتا تھا جو اس کی مزاحمت کے مراکز کے محافظ ہوسکتے تھے۔ اس لیے، اس نے ان میں سے بیشتر کو پکڑ کے سولی پر چڑھا دیا۔

سکندر کی یہ خوش بختی تھی کہ ٹکشلا کا حکمراں ابھی، جو حال ہی میں تخت نشیں ہوا تھا، عظیم پورس سے کینہ رکھتا تھا، جو سندھ کے مشرقی علاقوں کا حکمراں تھا اور آس پاس کی چھوٹی ریاستوں کے لیے ایک خطرہ تھا جس میں ٹکشلا بھی شامل تھا۔ اس لیے، ٹکشلا کے اس نوجوان حکمراں نے سکندر کی پیش قدمی سے فائدہ اٹھایا، اور اسے قیمتی تحائف دینے کے بعد اپنے دارالحکومت میں مدعو کیا۔

آمبھی بذات خود سکندر کے ساتھ ٹکشلا میں داخل ہوا۔ ٹکشلا میں اس فراوانی کے ساتھ یونانیوں کا خیر مقدم ہوا اور آمبھی کی فوج اتنی مستحکم تھی کہ سکندر کو دغابازی کا خوف ہوا۔ لیکن آمبھی نے اپنی پوری فوج سکندر کے انتظام و انصرام میں کھڑی کردی۔ اس کا اصل مقصد پورس کو تسخیر کرنے میں سکندر کی مدد کرنا تھا جو کہ ریاست ٹکشلا کا دشمن اور ممکنہ خطرہ تھا۔

سکندر کے ٹکشلا آنے سے قبل یونانیوں نے جو کچھ بھی مالِ غنیمت حاصل کیا تھا وہ مویشیوں کے گلّے پر مشتمل تھا۔ ٹکشلا میں انھوں نے حقیقی دولت دیکھی جس نے ان کی آنکھیں کھول دیں۔ یہ صرف ایک علمی مرکز ہی نہیں تھا بلکہ ایک عظیم وسیع المشرب مرکز بھی تھا۔ یہاں کا شادی بازار بابل کے طرز کا تھا، اور مردہ لیموں کو گدھوں کے حوالے کر دینے کا رواج شاید ایران کے زرتشتوں کی پیروی میں تھا۔ انھوں نے برہنہ سادھوؤں (جین) کو بھی دیکھا جن میں سے ایک سکندر کے وفد میں شامل ہوگیا تھا اور ہندستان چھوڑنے تک اس کے ساتھ رہا۔

ٹکشلا سے ہی سکندر نے پورس اور اس کے ساتھی ابھیسار کو پیغامات بھیجے کہ وہ آکر اس سے ملیں۔ پورس نے نہ صرف انکار کردیا، بلکہ بڑے ہی فخریہ انداز میں جواب بھیجا کہ وہ اس کی سرحد پر ہتھیاروں کے ساتھ ہی ملیں گے۔ سکندر نے جہیلم کی طرف کوچ کیا۔ پورس کی فوجوں نے اس کی پیش قدمی میں رکاوٹ پیدا کی۔ یہ جولائی کا مہینہ تھا۔ بارش آچکی تھی اور ندی میں سیلاب آیا ہوا تھا۔ ہندستان کے مذہبی عقائد بارش کے موسم میں سفر کرنے یا فوجی معرکوں سے روکتے تھے۔ سکندر کے لیے حالات بالکل سازگار تھے۔ ایک مصنوعی حملے کے ذریعے پورس کی فوجوں کی توجہ ہٹانے کے بعد وہ چپکے سے 32 کلومیٹر تک آگے بڑھ گیا اور جزیرے کی جھاڑیوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے ندی کو عبور کرلیا اور پورس کی فوجوں پر دھاوا بول دیا۔ ناواقفیت کی بنا پر پورس کی فوجوں کو ایک بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے رتھ کیچڑ میں پھنس گئے۔ پورس کے فوجی ناکام ہوگئے کیونکہ یونانی سوار فوجی ہندستانی گھوڑ سواروں سے بدرجہا بہتر تھے اور ہاتھیوں کے ذریعے ایک متحرک اور تجربہ کار دشمن کے خلاف جیت حاصل کرنے کے لیے گہرے ماہرانہ علم کی ضرورت تھی۔ وہ دیوانہ وار بھاگے اور دوست اور دشمن میں تمیز کرنا بھول گئے۔ صرف ایک ہی ہتھیار ایسا تھا جو کسی حد تک یونانیوں کا مقابلہ کرسکتا تھا وہ تھے ہندستانی تیر کمان اور ایرین کے مطابق جو میگاستھنیز کے قول کو دہراتا ہے، ان کی مار کو کوئی بھی چیز نہیں روک سکتی تھی۔ چھ فٹ لمبے کمانوں سے مارے گئے تیر ڈھالوں اور سینے پر باندھی جانے والی لوہے کی دھاتوں دونوں کو ایک ساتھ چیرتے ہوئے گزر سکتے تھے۔

فطرت اب ہندستانی تیراندازوں کے خلاف تھی۔ لمبے کمانوں کے سرے جنھیں چکنی زمین پر نہیں رکھا جاسکتا تھا، اپنے خطرناک تیروں کو پوری قوت کے ساتھ نہیں پھینک سکتے تھے۔ حالانکہ، سکندر نے عظیم پورس کی شجاعت کا اندازہ لگا لیا تھا جو چھ فٹ سے بھی لمبا تھا۔ اس نے ٹکشلا کے راجہ کو فوری طور پر پورس کے پاس ایک پیغام کے ساتھ بھیجا۔ لیکن پورس نے ایک غدار کو سننے سے بھی انکار کردیا اور اس پر ایک نیزے سے وار کیا۔ آمبھی جلدی سے سکندر کو اس کی خبر دینے کے لیے واپس لوٹا۔

پورس بڑی بہادری سے لڑا۔ اس کے دو بیٹے اور بیشتر افسران مارے گئے۔ پھر گھوڑ سواروں کا ایک دستہ پورس کے پاس آیا اور اس سے ہتھیار ڈالنے کو کہا، اس نے اپنا فرض انجام دیا۔ بری طرح سے زخمی اور تھکے ہوئے پورس کو پکڑ کر سکندر کے پاس لایا گیا۔

فاتح نے اس سے سوال کیا۔ ''تمھارے ساتھ کس طرح کا برتاؤ کیا جائے؟'' مغلوب پورس نے جواب دیا۔ ''ایک راجہ کی طرح۔''

سکندر نے اس کی عظمت کا اعتراف کیا۔ پورس کو دوبارہ سلطنت واپس کردی گئی۔ یہاں تک کہ سکندر نے Ghansai کا علاقہ بھی سونپ دیا جو اس نے پورس کے حلقۂ عمل میں سے فتح کیا تھا۔

اب سکندر نے چناب کو عبور کیا اور پھر راوی کو اور آخرکار ویاس کے ساحلوں تک پہنچا۔ اتنا آگے تک آجانے کے بعد اس نے پورے طمطراق کے ساتھ گنگا کے میدانوں تک جانے کا منصوبہ بنایا لیکن اس پورے راستے میں اس کی فوج کو بڑی سخت مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ دراصل وہ تھکن سے چور ہوگئے تھے اور انھوں نے آگے بڑھنے سے انکار کردیا۔ سکندر نے ان سے بار بار اپیل کی لیکن انھوں نے اس کی ایک نہ سنی۔ سکندر بہت دکھی تھا۔ وہ اپنے خیمے میں چلا گیا اور تین دن کے بعد باہر نکلا۔ اب وہ یونان واپس لوٹنے کے لیے تیار تھا۔

پلوٹارک، جو سکندر کے ذاتی خطوط پڑھنے کا دعوا کرتا ہے، لکھتا ہے، ''پورس کے ساتھ لڑائی نے مکدونیاؤں کی ہمت پست کردی تھی اور ہندستان میں ان کی مزید پیش قدمی کو روک دیا تھا۔ جب انھیں ایک ایسے دشمن کو شکست دینے میں اتنی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا جس کے پاس صرف بیس ہزار پیدل اور دو ہزار سوار فوج تھی، تو انھوں نے سوچا کہ ان کے پاس گنگا کو عبور کرنے کے سکندر کے منصوبے کی مخالفت کرنے کا جواز ہے جس کے بارے میں انھیں بتایا گیا تھا کہ وہ 32 فرلانگ چوڑی ہے اور اس کی گہرائی تقریباً چھ سو فٹ ہے، اور دوسری طرف اس کے کناروں پر کثیر تعداد میں دشمن موجود ہیں اور جیسا کہ انھیں بتایا گیا تھا کہ دوسری طرف مشرقی رجواڑے اَسّی ہزار گھوڑوں، دو لاکھ

پیادوں، آٹھ ہزار مسلح رتھوں اور چھ ہزار لڑاکو ہاتھیوں کے ساتھ ان کا انتظار کر رہے ہیں۔''

یہ حقیقت کہ وہ مگدھ کے نندراجا کو فتح کرنے کے لیے نہیں جاسکا، جو صرف گیارہ دنوں کی مسافت پر تھا، سکندر کے لیے بے حد افسوسناک بات تھی۔

اس نے ہندستان کے سب سے دور دراز علاقے تک پہنچنے کی ایک علامت کے طور پر وہاں بارہ بڑی قربان گاہیں بنوائیں اور سائلیکس کے ذریعے دریافت کیے گئے راستے کو اختیار کرکے سندھ کے دہانے تک پہنچا۔ وہ اپنی واپسی کے راستے میں جن علاقوں سے گزرا، ان پر قبضہ کرتا گیا اور ہندستان اور مغربی ایشیا کے درمیان ترسیل کے ممکنہ وسائل، بری اور بحری دونوں ذرائع سے دریافت کیے۔ تقریباً دو ہزار کشتیوں کا ایک دستہ، وافر سازوسامان، مالِ غنیمت اور غیر متحارب سپاہیوں کے ساتھ واپسی کے سفر پر روانہ ہوا جبکہ ہندستانی تماش بین، یونانی مورخین کے مطابق، اپنے وحشیانہ انداز میں رقص کر رہے تھے اور گیت گا رہے تھے۔

پلوٹارک کے مطابق، ''اس سفر میں سکندر نے ہندستانی فلسفیوں کو بھی قیدی بنا کر اپنے ساتھ لے گیا تھا جو سبھاؤں (Sabhas) کو اس کے خلاف بغاوت پر آمادہ کرنے میں بہت متحرک رہے تھے جس سے مکدونیوں کو بہت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

سکندر کی فوجوں کو جہلم کے دونوں کناروں سے چیلنج کیا گیا اور سلطنت مالوا اور شدرا کا (kshudrakas) کے قبائل سے انھیں سخت لڑائی کا سامنا کرنا پڑا، انھوں نے بھاری نقصان اٹھائے۔

آج کے عہد کے ملتان اور سکھر علاقوں میں مقامی باشندوں نے سخت مقابلہ کیا اور برہمنوں کو، جنھوں نے مقامی لوگوں کو ان غیر ملکیوں کے خلاف بغاوت پر اکسایا تھا، تہہ تیغ کردیا گیا۔ یونانی مصنفین کے مطابق، سکندر نے بڑے پیمانے پر تباہی مچائی اور قتلِ عام کیا، مقبوضہ شہروں کے باشندوں کو ہلاک کرتا گیا اور عورتوں اور بچوں کو بھی نہیں بخشا۔ اس معرکے میں صرف اکیلے نشیبی سندھ وادی میں ہی تقریباً اسّی ہزار ہندستانیوں کو قتل کیا گیا۔ سکندر نے سرحدی صوبے اور پنجاب کے علاقوں سے ستر ہزار غلاموں کو پکڑا۔

سکندر سندھ ڈیلٹا کے دہانے پر پاتالا میں پہنچا اور وہاں اپنی فوج کو تین حصوں میں بانٹ دیا۔ ان میں سے ایک کو ہاتھیوں کے ساتھ وزنی سامانوں کو لے کر کلا (Kula) درّے کے ذریعے بلوچستان کے راستے جانا تھا۔ دوسرے کو نیارکس (Nearchus) کی ماتحتی میں سمندر کے راستے سے جانا تھا اور تیسری ٹولی کو بذاتِ خود سکندر کی رہنمائی میں مکران کے ساحلوں کے ساتھ آگے بڑھنا تھا۔ تیسرے گروہ نے ستمبر 325 ق.م. میں اپنے سفر کا آغاز کیا۔ بابل کا راستہ بلوچستان سے ہوکر جاتا تھا جو ایک خشک قطعہ زمین تھا۔ سکندر کے پیاسے سپاہیوں نے تمام آداب کو بالائے طاق رکھ دیا۔ اس پوری ٹولی میں کہیں بھی کوئی ہیلمٹ یا نیزہ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن صرف پیالے، کاسے اور قیمتی دھاتوں کے پیالے تھے جن میں سپاہیوں نے شراب بھر رکھی تھی اور ایک دوسرے کو پلا رہے تھے۔ پورا ملک ان کے رقص و سرود، بانسریوں اور شوروغل سے گونج رہا تھا۔

آخر کار سکندر بابل پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر وہ بیمار پڑ گیا اور بیماری کے اس وقفے کے بعد اس نے غسل کرنے پر زور دیا۔ جس کے نتیجے میں اسے بہت تیز بخار ہوگیا جو مسلسل جاری رہا۔ چودھویں دن اس کے سپاہی محل کے دروازے پر آئے اور اندر جانے کی اجازت مانگنے لگے۔ سکندر کے جنرل اور افسران نے انھیں اجازت دی۔ پورا لشکر 33 سالہ سکندر کے قریب سے ترتیب وار گزرا جو خاموشی کے ساتھ لیٹا ہوا تھا۔ انھوں نے آنسوؤں کے ساتھ اسے تعظیم دی۔ دوسرے دن وہ مرگیا۔ اس سے بھی برا یہ ہوا کہ اس کی ماں اولمپس نے اپنا گلا کاٹ کر خودکشی کرلی اور سکندر کی بیوی رخسانہ (Roxana) اور اس کے شیر خوار بیٹے کو قتل کردیا گیا۔

سکندر کی فتوحات خطرے میں تھیں۔ ہندستان چھوڑنے سے قبل اس نے اپنے مفتوحہ علاقوں کے نظم و نسق کے انتظامات کردیے تھے۔ جبکہ پورس جہلم اور چناب کے درمیانی علاقوں کی دیکھ بھال کر رہا تھا، اور ٹکشلا اور ابھیسار کے راجہ، پورس کے مغربی اور شمالی علاقوں کے انتظام پر معمور تھے، وہیں سکندر نے مختلف مراکز پر بعض یونانی گورنروں کو بھی مقرر کردیا تھا۔ ان انتظامات میں سے اکثر جو کسی حد تک سکندر کی زندگی ہی میں کمزور پڑ گئے تھے، اس کی موت کے فوراً بعد بالکل ہی ختم ہوگئے۔

سنگ تراشی کو چھوڑ کر، یونانیوں سے وابستہ دوسرے اثرات صحرا میں پانی کی طرح غائب ہوگئے۔ دراصل، سکندر کی موت کے کچھ برسوں کے اندر ہی، پنجاب کی سرزمین پر موجود اس کی موجودگی کی تمام علامات مٹ گئیں۔ سندھ کے ساحلوں پر موجود مکدونیائی محافظ فوج مکمل طور سے نیست و نابود کردی گئی۔

یونانی مصنف جسٹن ہندستانی علاقوں کو مکدونوں سے آزاد کرانے کا سہرا Sandrocottus کے سر باندھتا ہے جو ممکنہ طور سے چندرگپت کا یونانی نام ہے، جو موریہ حکومت کا بانی تھا اور جس نے اپنے برہمن صلاح کار کوٹلیہ کی رہنمائی اور مدد سے، جسے چانکیہ کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، مگدھ کی آخری نند حکومت کو اکھاڑ پھینکا تھا اور یونانی گورنروں کو ہندستان سے باہر نکال دیا تھا۔

جب سکندر کے افسران اس کے پیچھے چھوڑی ہوئی عظیم حکومت پر قابض ہونے کے لیے جدوجہد کر رہے تھے اور سلوکس نے مشرقی علاقوں پر کنٹرول حاصل کرلیا اور ہندستان میں یونانی اقتدار پر دوبارہ قبضہ کرنے کے لیے آگے بڑھا، تو چندرگپت نے اسے سندھ کے کناروں پر اتنی زبردست شکست دی کہ

سیلوکس کو اسے اپنے تین حصول علاقے سونپنے پڑے جو کابل، قندھار اور ہرات کے علاقوں کے مماثل تھے۔ سیلوکس کو اپنی بیٹی کی شادی بھی چندرگپت سے کرنی پڑی اور بدلے میں اسے صرف 500 ہاتھی حاصل ہوئے۔ یہ دراصل دو بادشاہوں کے درمیان ایک معاہدے کی طرح تھا اور اس کی بنا پر پاٹلی پتر میں چندرگپت کی دارالحکومت مگدھ میں سیلوکس کے سفیر کی حیثیت سے میگاستھنیز کا تقرر عمل میں آیا۔

اس کے چند برسوں بعد اس کی حکومت دوبارہ تقسیم ہوئی۔ سندھ کے مشرقی علاقے پوری طرح آزاد قرار دے دیے گئے۔ کچھ چھوٹے اور دور دراز علاقوں کے بعض یونانی فوجی محافظ ہندستانی معاشرے کا حصہ بن گئے۔ ایک ذریعے کے مطابق، ان میں سے بعض نے کلّو وادی اور ہمالیہ کے دوسرے مغربی علاقوں میں پناہ حاصل کی، جہاں کے لوگوں جیسے گدیوں (Gaddia) میں گذشتہ عہد کے یونانیوں کی بعض مماثلتیں لباس وغیرہ میں پائی جاتی تھیں۔ قابل غور بات یہ ہے کہ ہندستان اور یہاں کے فلسفیوں کا ذکر بعض قدیم یونانی کتابوں میں ملتا ہے لیکن ہندستان کی قدیم کتابوں میں سکندر کا کوئی ذکر نہیں ہے، جبکہ سکندر کے ہندستانی حملے کے بعض بالواسطہ نتائج سامنے آئے ہیں۔

سکندر کے ہندستان آنے سے قبل یہاں پر بعض سلطنتیں یا قبائل آپس میں ایک دوسرے سے جنگ کر رہی تھیں۔ چار سلطنتیں جو اپنے پڑوسی علاقوں کو اپنے زیر نگیں کرنے میں مصروف تھیں وہ تھیں اونتی، کوشل، وتس، اور مگدھ، سکندر کے ہندستانی حملے کے نتیجے میں ایک طرح سے پہلی چندرگپت موریہ کی عظیم ہندستانی حکومت کا قیام عمل میں آیا جو ہمالیہ سے لے کر وندھیاچل اور اس کے آگے تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے کارنامے بے حد عظیم اور حکومت وسیع تھی۔ اس کی فوج میں 600,000 پیادے، 30,000 سوار، 9000 ہاتھی، اور 8000 رتھ تھے جنہیں کھینچنے کے لیے 24,000 آدمی تعینات تھے اور یہ پوری فوج چار حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ مزید دو ٹکڑیاں بحریہ اور نقل و حمل کی دیکھ بھال پر مامور تھیں۔

یہاں پر چندرگپت کے قابل منسٹر کوٹلیہ (چانکیہ) کی لکھی ہوئی "ارتھ شاستر" کا ذکر ضروری ہے۔ حالانکہ ایک راجہ کے فرائض پر اس سے قبل بھی مقالے ملتے ہیں جیسے کہ "منواسمرتی" مگر ارتھ شاستر شاید پہلی کتاب ہے جس میں کسی ریاست میں ایک عملی حکومت کے فن اور معاشی عناصر کے طریق کار کا ذکر ملتا ہے۔ مورخین نے اس کا موازنہ "میکیاویلی کی" دی پرنس" سے کیا ہے۔ جواہر لال نہرو اپنی کتاب "دی ڈسکوری آف انڈیا" میں کہتے ہیں، "اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے چانکیہ نے کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا تھا۔ وہ بہت ہی غیر محتاط تھا لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کا اصل مقصد ناموافق ذرائع کی بنا پر ناکام بھی ہو سکتا ہے۔"

مترجم کا پتہ:
355, Jhelum Hostel, JNU, New Delhi-67

[illegible]

مصنف: آشا نہیا، مترجم: ڈاکٹر صغریٰ مہدی
سرکس دیکھنا بچوں کا محبوب مشغلہ ہے۔ رامو اور کملا سرکس دیکھنے کے لیے ٹریکٹر پر سوار ہو کر شہر چلے۔ راستے میں ایک بے حد دلچسپ واقعہ پیش آیا۔
تفصیلات جاننے کے لیے کتاب کا مطالعہ کیجیے۔
صفحات: 16، قیمت: -/15 روپے

وائی اور بھوت

مصنف: دیویکا رنگاچاری، مترجم: شمیمہ بیگم
بھوتوں سے عام طور سے بچے ڈرتے ہیں۔ روی بھی ایک ایسا ہی لڑکا تھا جسے بھوت سے بڑا ڈر لگتا تھا لیکن جب وائی سے اس کی دوستی ہوئی تو یہ خوف جاتا رہا۔ ایک دلچسپ کہانی جو بچوں کو ضرور پسند آئے گی۔
صفحات: 16، قیمت: -/15 روپے

ڈاکیہ

مصنف: آر کے مورتی، مترجم: نجمہ نقوی
ایک بار جنگل کے راجا شیر نے ڈاکیے کے تقرر کے لیے ایک مقابلہ جاتی امتحان منعقد کیا جس میں جنگل کے بہت سے پرندوں اور جانوروں نے شرکت کی۔ لیکن اس میں کامیابی کنگارو کو ملی۔ یہ کامیابی اسے کیسے ملی، یہ جاننے کے لیے کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔
صفحات: 16، قیمت: 15 روپے

پتھروں کے دل

مصنف: وشا کا نجی، مترجم: غلام حیدر
بچوں کو جادو منتر والی کہانیاں بہت اچھی لگتی ہیں، "پتھروں کے دل" میں بھی ایسی ہی ایک کہانی بیان کی گئی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ کسی زمانے میں پتھروں کے بھی دل ہوا کرتے تھے لیکن ایک جادوگرنی نے اپنے جادو کے زور سے انھیں دل سے محروم کر دیا۔
صفحات: 16، قیمت: -/15 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

پطرس بخاری

سنیما کا عشق

''سنیما کا عشق'' عنوان تو عجیب ہوس خیز ہے لیکن افسوس کہ اس مضمون سے آپ کی توقعات مجروح ہوں گی، کیوں کہ مجھے تو اس مضمون میں کچھ دل کے داغ دکھانے مقصود ہیں۔

اس سے آپ یہ نہ سمجھیے کہ مجھے فلموں سے دلچسپی نہیں، یا سنیما کی موسیقی اور تاریکی میں جو کچھ رومان انگیزی ہے، میں اس کا قائل نہیں، میں تو سنیما کے معاملے میں اوائل عمری سے ہی بزرگوں کا موردِ عتاب رہ چکا ہوں۔ لیکن آج کل ہمارے دوست مرزا صاحب کی مہربانیوں کے طفیل سنیما گویا میری ایک دُکھتی ہوئی رگ بن کر رہ گیا ہے۔ جہاں اس کا نام سُن پاتا ہوں بعض درد انگیز واقعات کی یاد تازہ ہوجاتی ہے جس سے رفتہ رفتہ فطرت ہی کج بیں بن گئی ہے۔

اوّل تو خدا کے فضل سے ہم سنیما کبھی وقت پر نہیں پہنچ سکے، اس میں میری سُستی کو ذرا دخل نہیں، یہ سب قصور ہمارے دوست مرزا صاحب کا ہے جو کہنے کو تو دوست ہیں لیکن خدا شاہد ہے کہ ان کی دوستی سے جو نقصان ہمیں پہنچے ہیں کسی دشمن کے بھی تبضۂ قدرت سے باہر ہوں گے۔

جب سنیما جانے کا ارادہ ہوتا ہے تو ہفتہ بھر پہلے انھیں کہہ دیتا ہوں کہ کیوں بھئی مرزا جی، اگلی جمعرات کو سنیما چلو گے نا؟ میری مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ پہلے سے تیار رہیں اور اپنی تمام مصروفیتیں کچھ اس ڈھب سے ترتیب دے لیں کہ جمعرات کے دن ان کے کام میں کچھ حرج واقع نہ ہو لیکن وہ جواب میں عجیب قدر شناسی فرماتے ہیں۔

''ارے بھئی چلیں گے کیوں نہیں؟ کیا ہم انسان نہیں؟ ہمیں تفریح کی ضرورت نہیں ہوتی اور پھر کبھی ہم نے ایسی بے مروّتی آج تک برتی ہے کہ تم نے چلنے کو کہا ہو اور پھر ہم نے تمھارا ساتھ نہ دیا ہو؟''

اُن کی تقریر سُن کر میں کھسیانا سا ہوجاتا ہوں، کچھ دیر چُپ رہتا ہوں اور پھر دبی زبان سے کہتا ہوں۔

''بھئی اب کے ہوسکا تو وقت پر پہنچیں گے۔ ٹھیک ہے نا؟''

میری یہ بات عام طور پر ٹال دی جاتی ہے، کیونکہ اس سے اُن کا ضمیر کچھ تھوڑا سا بیدار ہوجاتا ہے، خیر میں بہت زور نہیں دیتا، صرف ان کو بات سمجھانے کے لیے اتنا کہہ دیتا ہوں۔

''کیوں بھئی! آج کل سنیما چھ بجے شروع ہوجاتا ہے نا؟''

مرزا صاحب عجیب معصومیت کے انداز میں جواب دیتے ہیں۔

''بھئی یہ ہم کو معلوم نہیں''

''میرا یہ خیال ہے چھ بجے ہی شروع ہوتا ہے۔''

''اب تمھارے خیال کی کوئی سند نہیں۔''

''نہیں مجھے یقین ہے، چھ بجے شروع ہوتا ہے؟''

''تمھیں یقین ہے تو میرا دماغ کیوں مفت میں چاٹ رہے ہو؟''

اس کے بعد آپ ہی کہیے کہ کیا بولوں؟

خیر جناب! جمعرات کے دن چار بجے ہی ان کے مکان پر روانہ ہوجاتا ہوں۔ اس خیال سے جلدی جلدی انھیں تیار کراکے وقت پر پہنچ جائیں، دولت خانے پر پہنچتا ہوں تو آدم نہ آدم زاد۔ سارے مردانے کمرے گھوم جاتا ہوں، ہر کھڑکی سے جھانکتا ہوں، ہر شگاف سے آواز دیتا ہوں، لیکن کہیں سے رسید نہیں ملتی۔ آخر تنگ آکر ان کے کمرے میں بیٹھ جاتا ہوں، وہاں دس پندرہ منٹ سیٹیاں بجاتا رہتا ہوں۔ دس پندرہ منٹ بلاٹنگ پیپر پر تصویریں بناتا رہتا ہوں، پھر سگریٹ سلگاتا ہوں اور باہر ڈیوڑھی میں نکل کر ادھر اُدھر جھانکتا ہوں۔ وہاں بدستور ہُو کا عالم دیکھ کر کمرے میں واپس آجاتا ہوں اور اخبار پڑھنا شروع کردیتا ہوں۔ ہر کام کے بعد مرزا صاحب کو آواز دے لیتا ہوں، اس اُمید پر کہ شاید ساتھ کے کمرے میں یا مین اوپر کے کمرے میں تشریف لے آئے ہوں؟ سو رہے تھے تو ممکن ہے جاگ اُٹھے ہوں؟ یا نہا رہے تھے تو شاید غسل خانے سے باہر نکل آئے ہوں؟ لیکن میری آواز مکان کی وسعتوں سے گونج کر واپس آجاتی ہے، آخر کار ساڑھے پانچ بجے کے قریب زنانے سے تشریف لاتے ہیں۔ میں اپنے کھولتے ہوئے خون کو قابو میں لاکر متانت اور اخلاق کو بڑی مشکل سے مدِّ نظر رکھ کر پوچھتا ہوں۔

''کیوں حضرت— آپ اندر ہی تھے؟''

''میری آواز آپ نے نہیں سُنی؟''

''اچھا یہ تم تھے، میں سمجھا کوئی اور ہے۔''

آنکھیں بند کرکے سَر کو پیچھے ڈال لیتا ہوں اور دانت پیس کر غصے کو پی جاتا ہوں، اور پھر کانپتے ہوئے ہونٹوں سے پوچھتا ہوں۔

''تو اچھا آپ چلیں گے یا نہیں؟''

''وہ کہاں—؟''

''ارے بندۂ خدا، آج سنیما نہیں جانا۔؟''

''ہاں ہاں، سنیما سنیما، یہ کہہ کر وہ کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں، ٹھیک ہے سنیما میں بھی سوچ رہا تھا کہ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے ایسی جو مجھے یاد نہیں آتی، اچھا ہوا تم نے یاد دلایا— ورنہ مجھے رات بھر الجھن رہتی۔

''تو پھر اب چلیں۔''

''ہاں وہ تو چلیں گے ہی، میں سوچ رہا تھا کہ آج ذرا کپڑے بدل لیتے، خدا جانے دھوبی کمبخت کپڑے بھی لایا ہے یا نہیں، یاران دھوبیوں کا تو کوئی انتظام کرو۔ اگر قتلِ انسانی ایک سنگین جرم نہ ہوتا تو ایسے موقع پر مجھ سے ضرور سرزد ہو جاتا، لیکن کیا کروں، اپنی جوانی پر رحم کھاتا ہوں، بے بس ہوں، صرف یہ ہی کہہ سکتا ہوں۔

''بھئی مرزا، للہ مجھ پر رحم کرو، میں سینما چلنے کو آیا ہوں، دھوبیوں کا انتظام کرنے نہیں آیا، یار بڑے بدتمیز معلوم ہوتے ہو، پونے چھ بج چکے ہیں اور تم جوں کے توں بیٹھے ہو۔''

مرزا صاحب عجیب مُربیانہ تبسم کے ساتھ کرسی سے اُٹھتے ہیں گویا یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ اچھا بھئی تمھاری طفلانہ خواہش آخر ہم پوری کر ہی دیں۔ چنانچہ پھر یہ کہہ کر تشریف لے جاتے ہیں کہ اچھا کپڑے پہن آؤں۔

مرزا صاحب کے کپڑے پہننے کا عمل اس قدر طویل ہے کہ اگر میرا اختیار چلے تو قانون کی رُو سے انھیں کپڑے اُتارنے ہی نہ دوں۔ آدھ گھنٹے کے بعد وہ کپڑے پہنے ہوئے تشریف لاتے ہیں۔ ایک پان منھ میں اور دوسرا ہاتھ میں بھی، اُٹھ کھڑا ہوتا ہوں۔ دروازے تک پہنچ کر مڑ کے دیکھتا ہوں تو مرزا صاحب غائب، پھر اندر جاتا ہوں، مرزا صاحب کسی کونے میں کھڑے کچھ کُرید کر رہے ہیں۔

''ارے بھائی چلو—''

''چل تو رہا ہوں یار، آخر اتنی بھی کیا آفت ہے۔؟

''اور یہ تم کیا کر رہے ہو۔؟

''پان کے لیے تمباکو لے رہا تھا۔''

تمام راستے مرزا صاحب چہل قدمی فرماتے رہے ہیں— ہر دو تین لمحے کے بعد اپنے آپ کو اُن سے چار پانچ قدموں آگے پاتا ہوں، کچھ دیر ٹھہر جاتا ہوں تو پھر چلنا شروع کر دیتا ہوں...... پھر آگے نکل جاتا ہوں...... پھر ٹھہر جاتا ہوں...... غرضیکہ چلتا دوگنی رفتار سے ہوں اور پہنچتا اُن کے ساتھ ہوں۔

ٹکٹ لے کر اندر داخل ہوتے ہیں تو اندھیرا گھُپ۔ بہتیرا آنکھیں جھپکاتا ہوں کچھ سُجھائی نہیں دیتا۔ اُدھر سے کوئی آواز لگاتا، دروازہ بند کر دو جی۔ یا اللہ اب جاؤں کہاں— رستہ، کرسی، دیوار، آدمی کچھ بھی تو نظر نہیں آتا، ایک قدم اور آگے بڑھاتا ہوں تو سَر اُن بالٹیوں سے جا ٹکراتا ہے جو آگ بجھانے کے لیے دیوار پر لگی رہتی ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد تاریکی میں کچھ دُھندلے سے نقش دکھائی دینے لگتے ہیں، جہاں ذرا تاریک سا دھبہ دکھائی دے جائے وہاں سمجھتا ہوں خالی کرسی ہوگی، خمیدہ پشت ہوکر اس کا رُخ کرتا ہوں، اس کے پاؤں کو پھاندا، اس کے گھٹنوں کو ٹکرا، خواتین سے دامن بچا، آخرکار کسی کی گود میں جا بیٹھتا ہوں تو وہاں سے نکال دیا جاتا ہوں، اور لوگوں کے دھکّوں کی مدد سے کسی خالی کرسی تک جا پہنچتا ہوں، مرزا صاحب سے کہتا ہوں۔ میں نہ بکتا تھا کہ جلدی چلو، خواہ مخواہ ہم کو رُسوا کر دیا نا! گدھا کہیں کا! اس شگفتہ بیانی کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ساتھ کی کُرسی پر جو بزرگ بیٹھے ہیں اور جن کو میں مخاطب کر رہا ہوں وہ مرزا صاحب نہیں کوئی اور بزرگ ہیں۔

اب تماشے کی طرف متوجہ ہوتا ہوں اور سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ فلم کون سی ہے؟ اس کی کہانی کیا ہے؟ اور کہاں تک پہنچ چکی ہے؟ سمجھ میں صرف اس قدر آتا ہے کہ ایک عورت اور ایک مرد جو پردے پر بغل گیر نظر آتے ہیں ایک دوسرے کو چاہتے ہوں گے، اس انتظار میں رہتا ہوں کہ کچھ لکھا ہوا سامنے آئے تو معاملہ کھُلے، اتنے میں سامنے کی کُرسی پر بیٹھے ہوئے حضرت ایک وسیع اور فراخ انگڑائی لیتے ہیں جس کے دوران میں کم از کم دو تین سو فٹ فلم گزر جاتی ہے جب انگڑائی کی لپیٹ لیتے ہیں تو پھر سر کھُجانا شروع کرتے ہیں، اور اس عمل کے بعد ہاتھ کو سر سے نہیں ہٹاتے بلکہ بازو کو ویسے ہی خمیدہ رکھے رہتے ہیں، میں مجبوراً سر کو نیچا کر کے چائے دانی کے دستے کے بیچ میں سے اپنی نظر کے لیے راستہ نکال لیتا ہوں اور اپنے بیٹھنے کے انداز سے بالکل مختلف ایسا معلوم ہوتا ہوں جیسے ٹکٹ خریدے بغیر اندر گھس آیا ہوں، اور چوروں کی طرح بیٹھا ہوا ہوں۔ تھوڑی دیر کے بعد انھیں کُرسی کی پشت پر کوئی مچھر یا پالتو پسّو معلوم ہوتا ہے، چنانچہ وہ دائیں طرف سے اُونچے ہوکر بائیں طرف کو جھک جاتے ہیں، میں مصیبت کا مارا دوسری طرف جھک جاتا ہوں، ایک دو لمحے بعد ہی وہ مچھر دوسری طرف ہجرت کر جاتا ہے، چنانچہ ہم دونوں مچھر سے پینترا بدل لیتے ہیں۔ غرض یہ دل لگی یُوں ہی جاری رہتی ہے، وہ دائیں تو میں بائیں، میں بائیں تو وہ دائیں۔ ان کو کیا معلوم کہ اندھیرے میں کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے، دل یہی چاہتا ہے کہ اگلے درجے کا ٹکٹ لے کر اُن کے آگے جا بیٹھوں اور کہوں ''لے بیٹا'' دیکھوں تو اب تُو کیسے فلم دیکھتا ہے۔

''پیچھے سے مرزا صاحب کی آواز آتی یار تم سے نچلا نہیں بیٹھا جاتا، اب جو ہمیں ساتھ لائے ہو تو فلم دیکھنے دو۔''

اس کے بعد غصّے میں آکر آنکھیں بند کر لیتا ہوں، اور قتل عمداً، خودکشی، زہرخورانی کے معاملات پر غور کرنے لگتا ہوں، دل میں کہتا ہوں، ایسی کی تیسی اس فلم کی، سو سو قسمیں کھاتا ہوں کہ پھر کبھی نہ آؤں گا، اور اگر آیا بھی تو اس کمبخت مرزا سے ذکر نہیں کروں گا۔ پانچ چھ گھنٹے پہلے آجاؤں گا، اُوپر کے درجے میں سب سے اگلی قطار میں بیٹھوں گا، تمام وقت اپنی نشست پر اُچھلتا رہوں گا، بہت بڑے طرّے والی پگڑی پہن کر آؤں گا، اپنے اُوورکوٹ کو دو چھڑیوں پر لٹکا دوں گا۔ بہرحال مرزا کے پاس نہ پھٹکوں گا۔

لیکن اس کمبخت دل کو کیا کروں، اگلے ہفتے پھر کسی اچھی فلم کا اشتہار دیکھ پاتا ہوں تو سب سے پہلے مرزا کے پاس جاتا ہوں، اور گفتگو پھر وہیں سے شروع ہوتی ہے کہ کیوں بھئی مرزا اگلی جمعرات کو سینما چلو گے نا؟

□□□

سلیمان اطہر جاوید

رپورتاژ

پانچواں کل ہند اردو کتاب میلہ

4 دسمبر، شام کے پانچ بجنے میں ابھی کچھ دیر ہے۔ مدینہ بلڈنگ سے عدالت العالیہ اور سٹی کالج کی طرف جانے والی سڑک، یوں بھی شہر کی ایک نہایت مصروف سڑک ہے۔ لیکن آج ٹریفک کچھ زیادہ ہی معلوم ہوتی ہے جو مدینہ بلڈنگ سے کچھ آگے جاکر بائیں طرف محمد قلی قطب شاہ اسٹیڈیم میں داخل ہوتی ہے۔ اسٹیڈیم میں داخل ہوتے ہی محسوس نہ ہوگا کہ ہم ایسے پرشور راستوں سے گزر آئے ہیں۔ نہایت کشادہ، پرسکون اور سہانا حصہ، سورج بھی اپنا سفر ختم کررہا ہے۔ ہلکی ہلکی خنکی کے سبب یہ ڈھلتی دھوپ خوب صورت لگ رہی ہے۔ چارسمت صاف ستھرے، سلیقے سے جمے ہوئے اسٹال، اردو، اردو اور صرف اردو کی کتابیں۔ اردو کے اتنے اسٹال اور اتنی کتابیں، دیکھنے میں بہت کم آتی ہیں۔ جی ہاں! ہم اس وقت قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیرِ اہتمام چھٹے کل ہند اردو کتاب میلے میں ہیں جو آندھرا پردیش اردو اکادمی، ادارہ ادبیات اردو اور انجمن ترقی اردو کے اشتراک سے عمل میں آیا ہے۔ افتتاحی تقریب کچھ ہی دیر میں شروع ہونے والی ہے جو لوگ جلد آچکے، ادھر ادھر کھڑے باتیں کررہے ہیں یا اسٹالوں پر کتابیں دیکھ رہے ہیں۔ قومی کونسل کے ڈائرکٹر، ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ اور ان کا عملہ مصروف عمل ہے۔

مہمانانِ خصوصی ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، جناب حسام صدیقی، ڈاکٹر خلیق انجم اور پروفیسر مغنی تبسم تشریف لاچکے ہیں۔ ہمارے ہاں ایسی تقریبات میں وزرا کی آمد میں تاخیر کے باعث کارروائی عموماً وقت پر شروع نہیں ہوتی لیکن وزیر اطلاعات و تعلقات عامہ حکومتِ آندھرا پردیش نے اپنی الگ شناخت قائم کرلی ہے۔ انھیں شاید ہی کسی تقریب میں دیر سے آتا ہوا پایا گیا۔ لیجیے وہ آگئے۔ اس تقریب کی صدارت جسٹس بلال نازکی کرنے والے ہیں وہ بھی تشریف لاچکے ہیں۔ جناب محمد علی شبیر نے کتاب میلے کی رسمِ افتتاح انجام دی۔ دھوپ اور ڈھل گئی ہے۔ منظر دلکش اور پرفضا ہوگیا ہے۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ وزیر اطلاعات اور دیگر مہمانانِ خصوصی کو اسٹالوں کا معائنہ کرارہے ہیں۔ تقریب کا آغاز ہونے والا ہے، سب لوگ وسیع و عریض اور سجے پنڈال میں آگئے ہیں۔ جناب حسن فرخ نے مائیک سنبھال لیا ہے، وہ اس تقریب کی نظامت کریں گے۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے قومی کونسل کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کتاب میلوں کی افادیت کو اُجاگر کیا۔ انھوں نے کہا کہ قبل ازیں پانچ کتاب میلے منعقد کیے جاچکے ہیں اور چھٹا میلہ اس وقت منعقد ہورہا ہے جب کہ ملک میں کئی تبدیلیاں آچکی ہیں اور آرہی ہیں۔ اب ملک کا منظرنامہ خاصا بدل چکا ہے۔ ستاون سال بعد اردو کی ترویج و ترقی کی باتیں ہورہی ہیں۔ اب اقلیتوں بالخصوص اردو اقلیت کے تعلق سے بھی تبدیلیاں آرہی ہیں۔ آج ملک کے سامنے، اردو والوں کے سامنے نئے نئے مسائل، نئے نئے چیلنجیز ہیں۔ ٹیکنالوجی کی ترقی کے اس دور میں دیکھنا یہ ہے کہ ہم عالمی ٹیکنالوجی اور کمپیوٹر کے اس دور کا حصہ بن پارہے ہیں یا نہیں۔ اردو کے ساتھ جو بھی ناانصافیاں ہوئی ہوں، خوش آئند بات یہ ہے کہ اب ناانصافیوں کا دور ختم ہوچکا ہے۔ اردو کو اس کا حق مل رہا ہے۔ جسٹس بلال نازکی نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ میں خود کو اردو کا ادنیٰ طالب علم سمجھتا ہوں۔ نازکی صاحب نے مزید کہا کہ اگرچہ ان کی مادری زبان کشمیری ہے لیکن اردو گود لی ہوئی زبان ہے اور واقعہ یہ ہے کہ گود لیا ہوا بچہ اپنے بچے سے زیادہ عزیز ہوتا ہے۔ اردو بھی ہمیں بے حد عزیز ہے۔ انھوں نے کہا کہ کشمیر میں اردو پہلی سرکاری زبان ہے۔ کشمیر میں ریونیو کی زبان اردو ہے۔ اردو پولس کے محکموں میں ہے۔ عدالتوں میں چالان اردو میں پیش کیے جاتے ہیں اور جج حضرات فیصلے بھی اردو میں لکھتے ہیں۔ اردو اس ملک کی زبان ہے۔ اردو پر جتنی زیادتیاں ہونی تھیں وہ ہوچکیں، اب اور زیادتیاں ممکن نہیں۔ اتنی زیادتیوں کے بعد اردو جب مری نہیں تو اب اس کے مرنے کا سوال ہی نہیں۔ اب یہ مسئلہ نہیں کہ اردو زندہ رہے گی یا نہیں کیونکہ ہندستان کے علاوہ یہ زبان، امریکہ، کینیڈا، ناروے اور مشرق وسطیٰ کے ممالک میں بولی اور سمجھی جانے لگی ہے۔ اب اردو کے مرنے کا کوئی اندیشہ نہیں۔ جسٹس بلال نازکی نے کہا کہ وقت کی اہم ضرورت یہ ہے کہ ہم ایک اور سرسید پیدا کریں۔ ہم کو آج کے ماحول میں پیچھے نہیں رہنا چاہیے۔ اردو کے ساتھ ہمارا جذباتی رشتہ ہے لیکن یہ رشتہ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ ہم اردو کو لے کر دوسری چیزوں کو چھوڑ دیں۔ ہمیں اردو سے اس لیے بھی محبت ہے کہ ہم عربی، فارسی نہیں جانتے۔ ہم برصغیر کے رہنے والے اردو کے ذریعے ہی اپنے مذہب سے واقف ہوسکے ہیں۔ نازکی صاحب نے نئی نسل کو مشورہ دیا کہ وہ اردو کے ساتھ انگریزی سے بھی واقف ہوں۔ انگریزی کے بغیر اس ملک کے رہنے والوں کا کوئی مستقبل نہیں۔ خواہ

اردو والے ہوں، ہندی والے، تمل والے یا کوئی اور زبان والے، انگریزی سب کے لیے ضروری ہے۔ وزیر اطلاعات و تعلقات عامہ حکومت آندھرا پردیش جناب محمد علی شبیر نے کہا کہ اس میلے کا انعقاد اور اس کا افتتاح ایک مسرت بخش عمل ہے۔ حیدرآباد میں اردو زبان و ادب کی ترقی کے کام زیادہ ہوئے ہیں۔ تعلیمی سطح پر بھی خاطر خواہ کام انجام پایا ہے۔ جنوبی ہند میں تعلیم کے امکانات وسیع ہیں۔ مسلمانوں کے لیے تحفظات کے مسئلے کا ذکر کرتے ہوئے وزیر اطلاعات نے کہا کہ ان تحفظات کی ضرورت ہے۔ اس جانب میں پیش رفت بہت ضروری ہے۔ جب ان کا اطلاق ہوگا تو تعلیمی طور پر انقلاب آجائے گا۔ تحفظات پر عمل کیا جائے گا تو کئی لوگوں کا فائدہ ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ اسلام میں تعلیم کی اہمیت ہے جس قوم میں تعلیم عام ہوگی وہی قوم ترقی کرے گی۔ ہمارے ہاں تعلیم کا یہ عالم ہے کہ جماعت اول میں ہزاروں بچے داخلہ لیتے ہیں لیکن دسویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے ڈراپ آوٹ اتنا ہوجاتا ہے کہ دسویں جماعت میں بہت کم بچے رہ جاتے ہیں۔ جناب محمد علی شبیر نے کہا کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمیداللہ بھٹ مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے کتاب میلے کا اس عمدہ پیمانے پر انعقاد کیا۔ وزیر موصوف نے یہ بھی کہا کہ اردو کے سلسلے میں حیدرآباد کی اپنی تاریخ ہے ہم کو کتابوں کی اشاعت پر زور دینا چاہیے اور مشاعروں اور سمناروں پر خرچ کرنے کی بجائے بنیادی تعلیم اور بنیادی مسائل پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ صاحب نے کہا کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے کئی کام کیے ہیں۔ اردو کتابوں کی علمی اہمیت بھی ہے اور تفریحی اہمیت بھی۔ یہاں کتابوں کے مختصر اسٹال ہیں۔ اس کتاب میلے کی وجہ سے کتابوں کی نکاسی میں آسانی بھی ہوگی اور اضافہ بھی۔ یہاں بھی گذشتہ پانچ برسوں میں کتابوں کی نکاسی زیادہ ہی ہوئی ہے۔ گوڑ صاحب نے کہا کہ دکنی لکھنے پڑھنے والے کم ہوتے جارہے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ دکنی کی نئی لغت تیار کی جائے جس میں ان تمام الفاظ کو شریک کیا جائے جو تا حال شائع شدہ لغات میں نہیں ملتے۔ انجمن ترقی اردو کے معتمد ڈاکٹر خلیق انجم نے کہا کہ جہاں تک اردو کا تعلق ہے ہماری زندگی میں قومی اردو کونسل کا کردار بہت اہم ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو کے تعلق سے مرکزی اور ریاستی حکومتوں کا رویہ بدل گیا ہے۔ یہ خوش آئند بات ہے کہ ڈاکٹر محمد حمیداللہ بھٹ نے جب سے ڈائرکٹر کا عہدہ سنبھالا ہے قومی اردو کونسل کو نئی زندگی دے دی ہے۔ کتاب میلے منعقد کرکے انھوں نے کتابوں کے لکھنے والوں، چھاپنے والوں اور پڑھنے والوں کو ایک چھت کے نیچے جمع کردیا ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے یہ بھی کہا کہ اردو میں پڑھنے والوں کی کمی نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اب تک ہم ان تک پہنچ نہیں پارہے ہیں۔ اب ان کتاب میلوں کی وجہ سے یہ ممکن ہوسکا ہے۔ قومی کونسل نے بھٹ صاحب کی سرکردگی میں اردو کے لیے جتنا کام کیا ہے کسی اور نے نہیں کیا۔ بھٹ صاحب نے سارے ملک میں اردو کا ماحول بنا دیا ہے۔ معتمد عمومی ادارہ ادبیات اردو پروفیسر مغنی تبسم نے کہا کہ ادارہ ادبیات اردو کا قومی اردو کونسل سے گہرا رابطہ ہے۔ ادارے کی کئی سرگرمیاں قومی کونسل کی مرہون منت ہے۔ ہمارے ہاں کمپیوٹر، خطاطی، فنکشنل عربی کی تعلیم اور بعض پروجیکٹ قومی کونسل کے تعاون سے جاری ہیں۔ مغنی صاحب نے کتاب میلے کو انتہائی مفید قرار دیا اور یہ تجویز بھی رکھی کہ اس کتاب میلے کے ذریعے یہ جائزہ لیا جانا چاہیے کہ لوگ کیسی کتابیں پڑھنا پسند کرتے ہیں اور کیسی کتابیں چاہتے ہیں۔ تاکہ ناشرین اس تجزیے کی روشنی میں کتابوں کی اشاعت عمل میں لائیں۔ جناب حسام صدیقی نے کہا کہ ان دنوں اردو کے لیے ماحول اچھا ہے۔ یہ کہنا غلط ہے کہ اردو روزگار سے جڑی نہیں ہے۔ اردو روزگار سے جڑی ہوئی ہے۔ اردو شاعری اور غزلوں، گیتوں کے کیسٹس عام ہیں۔ ٹی.وی. میں وہی سیریل مقبول ہوتے ہیں جن میں اردو الفاظ کی آمیزش زیادہ ہوتی ہے۔ شمالی ہند میں تو پولس، سیاستداں اور انتظامیہ کے اعلا عہدیدار اردو سیکھنے کی طرف مائل ہیں۔ کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اردو سے واقفیت کے بغیر وہ اپنے فرائض اور ذمے داریاں احسن طریقے پر پورا نہیں کرسکتے۔ اب اردو کا ذوق عام ہورہا ہے۔ جناب جلیل پاشا نے کہا کہ ہمارے ملک میں اردو بولنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ آندھرا پردیش میں اردو کا کام بہت زیادہ ہورہا ہے اور اس قدر کام کہیں اور نہیں دکھائی دیتا۔ اقامتی اسکولوں کا سلسلہ بھی سب سے پہلے حیدرآباد میں شروع کیا گیا اور یہاں ایسے قریب پندرہ اسکول موجود ہیں اسی کے ساتھ اردو میڈیم اسکول مزید کھولے جانے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے مطالبہ کیا کہ تیلگو اسکولوں میں اردو کو دوسری زبان کی حیثیت سے شامل کرنا چاہیے۔ جلیل پاشا نے اردو درسی کتابوں کی تیاری پر زور دیتے ہوئے ڈاکٹر محمد حمیداللہ بھٹ کی کوششوں کی ستائش کی کہ بھٹ صاحب نے اردو والوں میں بیداری پیدا کردی ہے۔ تقریب کے اختتام پر کثیر تعداد میں موجود سامعین نے کتابوں کے اسٹالوں کا رخ کیا۔ سارا ماحول جگمگا رہا تھا۔ اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ سے منسوب یہ اسٹیڈیم یوں ہی جگمگاتا رہے، یہاں ایسی اردو تقاریب ہوتی رہیں یہی ہماری دعا ہے۔ جناب حسن فرخ نے جو اس تقریب کی کارروائی سلیقے سے چلا رہے تھے، منتظمین کی طرف سے مہمانوں اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔

(بشکریہ "سیاست"، حیدرآباد 18 ردسمبر 2004)

□□□

ممتاز انور

علی احمد فاطمی سے گفتگو

پروفیسر علی احمد فاطمی ہم عصر اردو فکشن پر خصوصی نظر رکھتے ہیں۔ ذیل میں جدید اردو ناول پر ان سے گفتگو پیش ہے۔

سوال: 1992 ہندستانی سماج و سیاست کا اہم سال ہے۔ اس سال ایک ایسا حادثہ ہوا جس نے زبان و ادب کو بھی متاثر کیا۔ افسانے اور ناول پر بھی اس کے اثرات پڑے۔ اس بارے میں کچھ بتائیے؟

جواب: سماج میں جب بھی کوئی بڑا حادثہ ہوتا ہے تو قلمکار بھی اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ لیکن ضروری نہیں کہ تخلیقی ادب میں اس کے اثرات فوراً دکھائی دینے لگیں۔ ہنگامی موضوع ہنگامی ادب بھی پیدا کرتا ہے اور کبھی کبھی اس کے اثرات دہائیوں میں پھیل جاتے ہیں۔ اگرچہ دونوں کی اہمیت اپنی اپنی جگہ پر ہے لیکن سوچ سمجھ کر لکھا جانے والا ادب اپنی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس حادثے کو بارہ تیرہ برس گزر گئے لہٰذا اب جو لکھا جا رہا ہے اس میں اسے گہرائی سے دیکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ادھر اردو میں کئی قابلِ ذکر ناول لکھے گئے ہیں جن میں اس حادثے کی گونج سنی جا سکتی ہے۔

سوال: اس موضوع پر جو ناول لکھے جا رہے ہیں کیا وہ حالات کی سچی تصویر پیش کر پا رہے ہیں؟

جواب: دیکھیے ادب، ادب ہوتا ہے، سماجیات یا معاشیات کی کتاب نہیں۔ ناول نگار کچھ بنیادی باتوں کو لیتا ہے پھر اپنے ڈھنگ سے ناول کا تانا بانا تیار کرتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ اسے حقیقت کو مسخ نہیں کرنا چاہیے تاہم وہ ناول ہی لکھ رہا ہوتا ہے کوئی تاریخی کتاب نہیں۔ ناول نویسی میں تخیل و تصور سے تو کام لینا ہی پڑتا ہے، کچھ کردار گڑھنے پڑتے ہیں اور ایک فضا قائم کرنی پڑتی ہے جس میں ارضی حقیقت اور تخیلاتی حقیقت کا امتزاج ہوتا ہے۔

سوال: فرقہ واریت کے موضوع پر ہندی میں کئی ناول لکھے گئے ہیں جو بڑے ناول سمجھے جا رہے ہیں مثلاً دودھ ناتھ سنگھ کا "آخری کلام" یا بعض دوسرے ناول۔ اس پایے کا ناول اردو میں کیوں نہیں آیا؟

جواب: اچھے، بہت اچھے اور برے ناول ہر دور میں لکھے گئے ہیں اور ہر زبان میں لکھے گئے ہیں۔ فرقہ واریت سے سب سے زیادہ متاثر مسلمان ہوئے ہیں اور اتفاق سے اردو میں جتنے اہم ناول نگار اس وقت لکھ رہے ہیں وہ بھی مسلمان ہیں۔ ہندی میں اصغر وجاہت یا منظور احتشام کو چھوڑ کر زیادہ تر ہندو ہیں۔ اس موضوع پر براہِ راست متاثر ہونے والوں اور براہِ راست زد میں نہ آنے والوں کی نفسیات میں جو فرق ہونا چاہیے وہ فرق موجود ہے۔ متاثر ہونے والے قلمکار جب حادثے کے فوراً بعد لکھیں گے تو ان کا جذباتی ہونا عین فطری ہے۔ جبکہ ناول لکھنے کے لیے جذباتی ہونے سے زیادہ موضوع سے Detach ہونا بھی ضروری ہوا کرتا ہے۔ جتنا آپ جذباتیت سے دور ہوں گے، معروضیت اور حقیقت کے قریب آئیں گے۔ پھر یہ بھی ہے کہ کسی حادثہ یا فرقہ وارانہ فسادات کو واقعاتی سطح پر دیکھنا اور لکھنا اور بات ہے اور تاریخی و تہذیبی تناظر میں اس کی جڑوں کو تلاش کرنا اور بات ہے۔ ''آگ کا دریا'' اور ''اداس نسلیں'' اسی لیے بڑے ناول ہو گئے۔ تازہ ناولوں میں ''مہاساگر''، ''وش منتھن''، ''بیان'' وغیرہ اچھے ناول ہیں۔ ''آخری کلام'' جیسا دوسرا ناول تو ہندی میں بھی موجود نہیں ہے۔

سوال: "آخری کلام" اور "وش منتھن" میں مسلمانوں کو مظلوم دکھایا گیا ہے۔ کیا یہ جانب داری نہیں ہے؟

جواب: کیا آپ کے خیال میں مسلمان مظلوم نہیں ہیں۔ کچھ لوگ ان میں بھی انتہا پسند یا فرقہ پرست ہو سکتے ہیں لیکن پوری جماعت پر یہ لیبل لگانا غلط ہے۔ ''وش منتھن'' کا مصنف مسلمان ہے لیکن ''آخری کلام'' کا مصنف تو ہندو ہے۔ تقریباً ساڑھے چار سو صفحات پر مشتمل یہ ناول بے حد تحقیق و تفکر کے بعد لکھا گیا ہے۔ حیرت ہے کہ اردو میں ایسا ناول کیوں نہیں لکھا گیا۔ کیا لوگ محنت نہیں کر رہے ہیں یا جو براہِ راست متاثر ہوتا ہے وہ لکھ ہی نہیں پاتا؟ ادب میں کوئی حتمی بات کہہ پانا مشکل ہے۔ اردو ناول نگار اس اہم موضوع پر سنجیدگی سے سوچ رہے ہیں اور دردمندی سے لکھ بھی رہے ہیں۔ غضنفر، عبدالصمد اور مشرف عالم ذوقی کے علاوہ یہاں کچھ اور نام بھی لیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً احمد صغیر اور محمد علیم وغیرہ جو اسی موضوع پر لکھ رہے ہیں۔

سوال: 1947 کی فرقہ واریت اور آج کی فرقہ واریت میں کیا فرق ہے، کیا یہ فرق ناولوں میں بھی دکھائی دے رہا ہے؟

جواب: فرق ہے اور یہ فرق دکھائی بھی دیتا ہے۔ 47 کے بعد فرقہ وارانہ فسادات حادثاتی تھے، ان کے پیچھے منصوبہ بندی نہ تھی لیکن آج کے فسادات بڑی حد تک منصوبہ بند ہوتے ہیں۔ پھر ہندستان کی فرقہ واریت کے انیک روپ ہیں۔ وہ کبھی یہاں کی سماجی ساخت اور ذات پات کی دین تھی۔ مسلمانوں کی آمد نے اس میں مذہبی رنگ بھرا لیکن آج کی فرقہ واریت صرف نسلی و مذہبی نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے مغربی پونجی واد کا شاطرانہ نظام کام کر رہا ہے۔ تعلیم و تدریس، تہذیب و ثقافت، کھیل کود یہاں تک کہ کھان پان تک اس عالم کارانہ سیاست اپنے قدم جما رہی ہے۔ کیا آپ کی اپنی کوئی سوچ ہے۔ اس تناظر میں ان ناولوں کو بطورِ خاص ''وش منتھن'' کو دیکھیے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ''آنگن'' وغیرہ سے آگے کے ناول ہیں۔

سوال: اردو کے تازہ ناولوں میں فرقہ واریت کے علاوہ اور کن موضوعات پر عمدہ ناول لکھے گئے ہیں؟

جواب: موضوعات اور بھی ہیں مثلاً پیغام آفاقی کے ناول ''مکان'' میں

جبر و استحصال کو موضوع بنایا گیا ہے۔ شموئل احمد کے ناول "مہاماری" میں کرپشن (Corruption) کو دکھلایا گیا ہے۔ حسین الحق کے ناولوں میں بکھراؤ، ٹکراؤ اور قدروں کا بدلاؤ ہے۔ سید محمد اشرف کے ناول "نمبردار کا نیلا" میں انسانی جبلت کی وحشت ناکی کو بڑے خوبصورت پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔ یعقوب یاور نے دو تاریخی نوعیت کے ناول لکھے ہیں "دل من" اور "عزازیل" مجھے یہ دونوں ناول بھی پسند آئے۔ علی امام نقوی اور انور خاں نے ممبئی کی زندگی پر ناول لکھے ہیں۔ جوگندر پال کا ناول "پار پرے" قیدیوں کی داستان ہے۔ ساجدہ زیدی نے "مٹی کے حرم" اور اقبال مجید نے "کسی دن" اور "نمک" لکھے ہیں۔ ایک اور ناول ہے جو اس دور کا سب سے اہم ناول ہے وہ ہے الیاس احمد گدی کا ناول "فائر ایریا" جو کوئلے کی کان میں کام کرنے والے مزدوروں کو لے کر لکھا گیا ہے۔

سوال: ایک خیال ہے کہ جدید دور ناولوں کا دور ہے۔ پھر بھی ہمارے ہاں اچھے اور بڑے ناولوں کی کمی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟

جواب: اہم بات یہ ہے کہ ناول لکھے جا رہے ہیں۔ الیاس احمد گدی معمولی افسانہ نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں، وہ "فائر ایریا جیسا ایک بڑا ناول لکھ جائیں گے، یہ کس نے سوچا تھا۔ ان کے بھائی غیاث احمد گدی جو ان سے بڑے اور اہم افسانہ نگار تھے، کوئی اچھا ناول نہ دے سکے۔ تخلیق کے بارے میں کوئی بات حتمی طور پر نہیں کہی جا سکتی۔ یہ عجیب و غریب سفر ہوا کرتا ہے، ناول لکھنا ایک مشکل کام ہے۔ لارنس نے کہا ہے کہ ناول زندگی کی ایک روشن کتاب ہے۔ ناول ایک ایسا ارتعاش ہے جو پورے انسانی معاشرے کے اندر لرزش پیدا کر سکتا ہے۔ سماج کی حقیقت، عصری صداقت اور تاریخ کی جبریت کو جس طرح ناول اپنے آپ میں جذب کرتا ہے کسی دوسری صنف ادب کے لیے مشکل ہے۔ بحرانی دور میں ناول کی اہمیت بڑھ جاتی ہے کہ اس کشاکش اور بحران کو جس قدر بہتر اور موثر ڈھنگ سے ناول پیش کرتا ہے دوسری اصناف نہیں، اس لیے آج کے دور میں ناول کو نثر کا رزمیہ کہا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہم ایک بار پھر انتشاری اور بحرانی دور سے گزر رہے ہیں۔ یہ بحران لمحاتی اور حادثاتی نہیں ہے بلکہ آج کے معاشرے کی جڑوں میں پیوست ہے۔ ایک زمانے میں ناول کی موت کا اعلان کر دیا گیا تھا مگر اب یہ صنف پھر اپنی زندگی کا ثبوت دینے لگی ہے۔

سوال: ناول کی تنقید کم کیوں لکھی جا رہی ہے؟

جواب: تخلیق ہی تنقید کو پیدا کرتی ہے۔ ہمارے عہد کے نقاد مصلحت و سیاست کا شکار ہیں۔ وہ ہم عصر تخلیقی ادب پر لکھنے سے کتراتے ہیں۔ دوستاں اور دشمناں بھی اپنا کام کرتے ہیں۔ اردو زبان کے معاملات بھی ہیں لیکن لوگ لکھ بھی رہے ہیں۔ یہاں اگر ایک طرف بزرگ ناقد سید محمد عقیل نے "جدید ناول کا فن" لکھی تو نگینہ جبیں جیسی نوجوان ناقد نے "اردو ناول کا سماجی اور سیاسی مطالعہ 47 کے بعد" لکھی۔ خاکسار بھی جدید ناول پر لکھتا ہی رہتا ہے۔

سوال: کچھ سرکاری ادارے اردو کے فروغ کے لیے کوشاں ہیں، ان میں قومی اردو کونسل نے اردو داں طبقے کو انفارمیشن ٹکنالوجی سے جوڑنے کی جو کوششیں کی ہیں ان سے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: عام طور پر اردو والے سائنس اور انفارمیشن کی دنیا سے بے خبر رہتے ہیں۔ ایک مدت تک اردو زبان و ادب سے مراد محض شاعری اور اردو شاعری سے مراد غزل گوئی ہی لی جاتی رہی ہے۔ لیکن ادھر چند برسوں میں جب سائنس اور ٹکنالوجی ناگزیر ہی ہوگئی تو اردو کے جن چند اداروں نے انفارمیشن ٹکنالوجی کے فوائد و مقاصد اردو والوں تک پہنچانے کی کوشش کی ہے ان میں قومی اردو کونسل کا نام سر فہرست ہے۔ اس کی اوّل وجہ تو اس کے ڈائرکٹر کا باخبر اور روشن خیال ہونا ہے دوسرے ان کا وہ طریقۂ فکر اور طریقۂ عمل جس نے اردو کے اس ادارے کو روایتی انداز میں صرف اردو والوں تک محدود نہیں رکھا۔ میری مراد اردو ادب کے لوگوں تک۔ کونسل کے رسالے "اردو دنیا" میں میں نے خود ایسے مضامین پڑھے ہیں جن سے مجھے روشنی ملی ہے۔ یہی نہیں اس ادارے کے سربراہ اور ان کا عملہ پورے ملک میں جا جا کر جس طرح مدرسوں اور غریب طبقوں میں اردو کی کتابیں، اردو کا کمپیوٹر اور دیگر انفارمیشن پہنچا رہے ہیں وہ نہایت قابل ستائش ہے۔ پرانی نسل اس سے فائدہ اٹھائے یا نہ اٹھائے لیکن نئی نسل پورے طور پر فائدہ اٹھا رہی ہے جس کے لیے قومی اردو کونسل مبارک باد کی مستحق ہے۔

سوال: اردو کو روزگار سے جوڑنے کے لیے کیا اقدامات کیے جاسکتے ہیں؟

جواب: اردو کو روزگار سے جوڑنے کے معاملات بھی جدید انفارمیشن سے وابستہ ہیں۔ اب اردو پڑھنے والا صرف اردو کا استاد ہی بنے یہ تصور ختم ہو گیا ہے۔ صحافت، انفارمیشن، میڈیا، ترجمہ، اسکرپٹ، فلم اور نہ جانے کتنے راستے کھل گئے ہیں جہاں اردو والا اپنی صلاحیت اور دلچسپی کے اعتبار سے روزگار کا راستہ چن سکتا ہے۔ اگر وہ صرف کمپیوٹر ہی سیکھ لے تو بھی کچھ راستہ نکل سکتا ہے۔ میرے کئی شاگرد ہیں جو کمپیوٹر سیکھ لینے کی وجہ سے اپنی روزی روٹی کما رہے ہیں۔ روزگار کا مسئلہ صرف اردو والوں کے لیے یا صرف ایک ملت کے لیے نہیں ہے بلکہ پورے ملک کا مسئلہ ہے جس پر ہم سبھی کو سوچنا ہے۔

سوال: قارئینِ "اردو دنیا" کے لیے آپ کیا پیغام دینا چاہیں گے؟

جواب: "اردو دنیا" کے قارئین سے میں یہی کہنا چاہوں گا کہ وہ غزلیں، نظمیں اور افسانے ضرور پڑھیں لیکن ان کا مطالعہ صرف یہیں تک محدود نہ رہے۔ آج ایک کامیاب زندگی کے لیے جدید علوم و فنون سے واقف ہونا ضروری ہے۔ دنیا کے حالات سے باخبر رہنا ضروری ہے۔ ترقی، تبدیلی، روشنی، کہاں کیا ہو رہا ہے ان سب پر نظر ضروری ہے۔ آج جدید علوم و فنون سے بے خبری موت کے مترادف ہوگی۔ جدید علوم کے مطالعے سے وژن بڑا ہوتا ہے اور آج کی دنیا میں اگر علم و عمل کے ساتھ وژن اور وزڈم نہیں ہے تو آپ بہت پیچھے رہ جائیں گے۔ سماجی و سائنسی موضوعات سے باخبر رہنا آج بہت ضروری ہو گیا ہے۔

Deptt. of Urdu, Alahabad University,
Alahabad (U.P.)

□□□

سید احمد خاں　　**ہماری مطبوعات**　　("آثار الصنادید" سے اقتباس)

ہندستانی فنِ تعمیر مسلمانوں کی آمد سے قبل

ہندستانی فنِ تعمیر کو دنیا بھر میں ایک ممتاز مقام حاصل رہا ہے۔ موہنجو داڑو اور ہڑپا کی تہذیب سے لے کر بارھویں صدی عیسوی کے اواخر تک ہندستانی فنِ تعمیر کی تقریباً چار ہزار سال کی شان دار تاریخ موجود تھی۔ ہندو فنِ تعمیر نے وسطِ ایشیا کے بعض ممالک کے فنِ تعمیر کو متاثر کیا تھا۔ مسلم فنِ تعمیر کے ہندستان میں داخل ہونے سے قبل ہی ہندو فنِ تعمیر مسلم فنِ تعمیر پر براہِ راست یا بالواسطہ طور پر اچھا خاصا اثر ڈال چکا تھا۔ لاہور (پاکستان) سے شائع ہونے والی انسائیکلو پیڈیا "اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ" میں ان اثرات کی نشان دہی کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ:

"ہند کے ساسانی فن کی بعض خصوصیات جو مسلمانوں نے اختیار کر لی تھیں، مثلاً دائروں میں بنی مرغول کی شکلیں اور پھولوں کی بیلیں، غالباً یہ خصوصیات ابتداً ہندستانی نمونے میں دکھائی گئی تھیں (اگرچہ ہندستان سے پہلے ان کا آغاز روم میں ہوا تھا) سلجوقیوں کے فن میں کچھ ہندستانی خصائص نظر آتے ہیں، جو وسطِ ایشیا کے ذریعے اُن تک منتقل ہوئے۔ اسی طرح غزنہ کی تعمیرات میں سنگِ مرمر کا زیادہ استعمال کیا گیا اس کی وجہ بھی یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہندستان کے سنگِ مرمر کے مندروں کا اثر پڑا...... ہندستان سے باہر ہندی عناصر کا سُراغ فاطمیوں کے آخری زمانے، ایوبیوں اور مصریوں کے مملوک فن میں لگایا جا سکتا ہے اور وہ بھی اس لیے کہ چھپے ہوئے سوتی پارچے گجرات سے مصر کو درآمد کیے جاتے تھے۔ رہا انڈونیشیا تو اسلام کی فتح کے بعد بھی یہاں ہندو مستغراتی فن رائج رہا۔ غیر مذہبی محلوں اور مکانوں کی تعمیر کا نقشہ برقرار رکھا گیا، بلکہ مسجدیں بھی اسی نقشے پر بنائی گئیں۔"(1)

غیر منقسم ہندستان میں جو آثارِ قدیمہ اب تک دریافت ہوئے ہیں۔ اُن میں سندھ (پاکستان) کے خیر پور ڈویژن کے کوٹ ڈیجی کے مقام پر کھدائی میں نکلی ایک محل کی ایسی دیوار ہے، جو خاصی اونچی ہے۔ یہ دیوار پہاڑیوں پر پتھروں اور کچی اینٹوں سے بنائی گئی ہے۔ اس کے بعد فنِ تعمیر کے دو نمونے ہیں جن کا تعلق موہنجو داڑو اور ہڑپا تہذیب سے ہے۔ جسے وادیِ سندھ کی تہذیب یا انڈس ویلی تہذیب بھی کہتے ہیں۔ موہنجو داڑو اور ہڑپا کے پورے شہر بیسویں صدی کے آغاز میں دریافت ہوئے تھے۔ یہ پانچ ہزار سال قبل کی تہذیب ہے۔ کھدائی میں موہنجو داڑو کی جو عمارتیں نکلی ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ:

1- موہنجو داڑو کی عمارتیں تعمیر اور تعمیر کے مسالے کے اعتبار سے بہت سادہ اور پُرشکوہ تھیں۔

2- تعمیر میں مستطیل نما پکی اینٹیں استعمال ہوتی تھیں۔

3- پتھروں کی مدد سے محرابیں بنائی جاتی تھیں اور یہ اُن اصل محرابوں سے مختلف تھیں جن کا طرزِ تعمیر مسلمان اپنے ساتھ لائے تھے۔

4- سلامی دار دیواروں کا رواج عام تھا۔ (اس طرح کی دیواریں تغلق عہد کی عمارتوں میں بھی ملتی ہیں)

5- دیواروں پر کسی طرح کی سجاوٹ نہیں کی جاتی تھی۔

6- ان عمارتوں کی تعمیر میں اقامتی افادیت کو پیش نظر رکھا جاتا اور کسی طرح کی آرائش سے کام نہیں لیا جاتا تھا۔

7- اگرچہ شہری منصوبہ بندی (Town Planning) کا فنِ تعمیر سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہے لیکن یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ موہنجو داڑو کے معماروں کے ہاں شہری منصوبہ بندی کا بھی بے پناہ شعور تھا۔

موہنجو داڑو کی اس تہذیب کے بعد ہندستان میں طویل عرصے تک تعمیراتی سرگرمیاں رُکی رہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب آریا بڑے پیمانے پر ہندستان میں وارد ہوئے۔ آریا چوں کہ زیادہ طاقتور تھے اور مقامی لوگوں کے مقابلے میں اُن کے پاس جنگ کے ہتھیار بھی بہتر تھے۔ اس لیے انھوں نے ہڑپا وغیرہ کے مقامی باشندوں کو شکست دے کر کچھ کو قتل کر دیا، کچھ کو وہاں سے فرار ہونے پر مجبور کر دیا اور باقی لوگوں کو غلام بنا لیا۔ مورخین کا خیال ہے کہ آریوں نے مقامی لوگوں کی عمارتوں اور شہروں کو بھی تباہ کر دیا۔ طویل عرصے تک

● آثارِ قدیمہ ہمارا عظیم تہذیبی ورثہ ہیں جن کا تعلق کسی ایک قوم یا مذہبی فرقے سے نہیں، یہ پوری انسانیت کا اثاثہ ہیں— سید احمد خاں کی اس مشہور کتاب میں دہلی کے آثارِ قدیمہ کے علاوہ مختلف علوم و فنون سے تعلق رکھنے والی ممتاز شخصیتوں کا بھی ذکر ہے جس سے کتاب کی اہمیت دو چند ہوگئی ہے۔ "آثار الصنادید" کا پہلا ایڈیشن 1847 میں شائع ہوا تھا، یہ تحقیقی ایڈیشن اسی پہلے ایڈیشن کی بنیاد پر تیار کیا گیا ہے اور گزشتہ ڈیڑھ سو برسوں کی دستبرد سے جو آثارِ قدیمہ محفوظ رہ گئے ہیں ان کی موجودہ حالت بھی اس میں بیان کر دی گئی ہے۔ تین جلدوں پر مشتمل 1138 صفحات کی اس کتاب کی قیمت 717 روپیے ہے۔ قومی اردو کونسل اپنی مطبوعات پر طلبہ اور اساتذہ کو 40فیصد کی خصوصی رعایت دیتی ہے۔

ویدک زمانے میں اور مہاتما بدھ کے عہد سے قبل یعنی تقریباً تیرہ سو سے پانچ سو سال قبل مسیح تک لوگ کچی اینٹوں، گارے، بانس، لکڑی، گھاس پھوس، پتوں اور چھپروں سے بنائے ہوئے مکانوں میں رہتے تھے۔ بعد کے زمانے یعنی برہمنی عہد میں جیسا کہ رامائن اور مہابھارت سے پتا چلتا ہے کہ شہروں اور مندروں کی تعمیر شروع ہوگئی تھی۔ چوں کہ ابھی تک ان عمارتوں کے آثار نہیں ملے ہیں، اس لیے یہ بتانا مشکل ہے کہ یہ عمارتیں کس انداز کی تھیں۔ اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ یہ فنِ تعمیر کا اچھا نمونہ رہی ہوں گی۔

موریہ عہد میں پتھروں اور لکڑی کی مدد سے مکان بنائے جانے لگے۔ موریہ عہد کی تعمیرات میں لکڑی کا استعمال کس درجہ ہوتا تھا اس کا اندازہ لکڑی کے اُن آثار سے ہوتا ہے، جو موریہ سلطنت کے دارالخلافہ پاٹلی پتر (پٹنہ) کے چاروں طرف سے دستیاب ہوئے ہیں۔

اشوک اعظم کے زمانے میں، جو موریہ عہد کا تیسرا بادشاہ تھا، ہندو فنِ تعمیر کو نئی زندگی ملی۔ واضح ہو کہ اشوک 263 قبل مسیح میں تخت نشین ہوا۔ 259 قبل مسیح میں اس نے بدھ مت اختیار کیا اور 225 قبل مسیح میں اُس کا انتقال ہوا۔

اس عہد کی عمارتوں میں پتھروں کا استعمال اور سنگ تراشی دونوں ایران سے آئیں۔ پاٹلی پتر (پٹنہ) میں ستونوں کے جو بالائی حصے ملے ہیں، اُن میں اور ایران میں Archaemind Art کے تحت تعمیر ہونے والی عمارتوں میں غیر معمولی مشابہت پائی جاتی ہے۔ اشوک ہی کے زمانے میں اُس فنِ تعمیر کا آغاز ہوا جس میں پہاڑوں کو تراش کر مندر اور خانقاہیں بنائی جاتی تھیں۔ ابتدا میں یہ مندر اور خانقاہیں بہت سادہ تھیں۔ لیکن آہستہ آہستہ محنت اور باریکی سے کام لے کر انھیں خوبصورت بنایا جانے لگا۔

اشوک کے زمانے کی ایسی بہت سی لاٹیں محفوظ ہیں جن پر اشوک کے احکامات اور اُس کی تعلیمات کندہ ہیں۔ برست وسانچی کی منبت تصویریں، جو بُدھ مذہب کی تاریخ ہیں، اس زمانے میں یا اس سے کچھ قبل وجود میں آئی تھیں۔ بُدھ مت کے زمانے میں بُدھ کے پیروؤں نے بڑے پیمانے پر ستوپا بنائے۔ ستوپا کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان میں اس عہد کی اہم شخصیتوں کو دفن کیا گیا ہے اور عمارت اس طرح تعمیر کی گئی ہے کہ اُس میں داخل ہونے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ ستوپا کے چاروں طرف لکڑی اور پھر کچھ زمانے بعد پتھر کے بہت خوب صورت کٹہرے بنائے گئے۔

اس زمانے میں بدھ مت کی خانقاہیں پہلے ایک منزلہ بنائی گئیں اور پھر دو منزلہ بنائی جانے لگیں۔ بہت سی عمارتوں میں محرابیں ملتی ہیں۔ یہ محرابیں بھی اصلی نہیں ہیں، بلکہ پتھروں اور لکڑی کی مدد سے بنائی گئی ہیں۔ نالندہ (بہار) بودھ گیا، بھیتر گاؤں کے اینٹوں سے بنے ہوئے مندروں میں محرابیں موجود ہیں۔ 1960 میں رتناگری اور کٹک میں کھدائی کی گئی، وہاں سے بدھ مت کی جو خانقاہیں نکلیں، اُن سب میں بھی محرابیں موجود ہیں۔

اشوک نے کئی عالی شان محل بھی تعمیر کرائے تھے۔ چینی بُدھ زائر فاہیان نے پاٹلی پتر کے محلات کے کھنڈر دیکھے تھے۔ وہ ان محلوں کی تعریف کرتا ہے۔ پہاڑوں کو تراش کر غار بنانے کا سلسلہ تقریباً ایک ہزار سال تک جاری رہا۔ ان میں ساتویں صدی تک بُدھ مت کی عبادت گاہیں ہیں۔ اس کے بعد برہمنی مذہب اور جین مت کی عمارتیں تعمیر ہونا شروع ہوئیں۔ یہ عمارتیں پتھروں یا لکڑی کی مدد سے بنائی گئی ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا آثار قدیمہ کے ایک ماہر ڈاکٹر چارلس فبھری نے میسور میں کھدائی کر کے ایک ایسا مندر دریافت کیا ہے جو اینٹوں سے بنائے گئے مندروں میں قدیم ترین ہے۔ یہ مندر تین سو سال قبل مسیح میں تعمیر ہوا تھا۔ مندر ایک چھوٹے سے کمرے پر مشتمل ہے اور اس کے سامنے چھت دار برآمدہ ہے۔ چوتھی صدی عیسوی میں پتھروں کے ساتھ ساتھ پکی ہوئی اینٹوں کا استعمال شروع ہوگیا تھا۔ فنِ تعمیر کے معاملے میں جنوبی ہند اگر شمالی ہند سے آگے نہیں تو اس کے برابر ضرور تھا۔

پہلی صدی قبل مسیح سے چوتھی صدی عیسوی کے دوران آندھرا میں جو عمارتیں بنیں اور جو مورتیاں تراشی گئیں ان پر بدھ مت کا گہرا اثر تھا۔ پانچویں صدی عیسوی میں چٹانوں کو تراش کر بدھ مت کے پیروؤں اور ہندوؤں دونوں نے مندر بنائے۔

مدراس کے قریب مہابلی پورم کے درو پدی رتھ مندر، ارجن مندر اور دھرم راجا رتھ مندر چٹانوں سے تراش کر بنائے گئے۔ اس کے علاوہ ساتویں صدی عیسوی میں مہابلی پورم میں پتھروں سے ایک مندر بنایا گیا جسے شوا مندر کہا جاتا ہے۔ جنوبی ہند کے بہت سے مقامات پر ایسے مندروں کے آثار ملتے ہیں، جن کا پوری دنیا کے فنِ تعمیر میں اعلاترین مقام ہے۔

ہندو فنِ تعمیر اور خاص طور سے مندروں کی تعمیر میں سنگِ تراشی کے ذریعے بہت زیادہ آرایش سے کام لیا گیا ہے۔ بعض ماہرین کا کہنا ہے کہ ہندو فنِ تعمیر میں آرایش اس حد تک کی گئی ہے کہ دیوار کا کوئی حصہ نہیں بچا۔ یہ خیال سو فیصدی درست نہیں ہے۔ ہندو فنِ تعمیر کے جو ابتدائی نمونے ملتے ہیں اُن میں دیواروں پر سجاوٹ بہت کم کی گئی ہے۔ کلاسکی عہد کی دیواروں پر بُت تراشی اور مختلف قسم کی آرایش سے متوازن انداز میں کام لیا گیا ہے۔

اس کے بعد آٹھویں صدی سے لے کر چودھویں صدی تک آرایش میں خاصا اضافہ ہوا۔ اور آہستہ آہستہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ دیواروں کا کوئی حصہ ایسا باقی نہیں رہا، جس پر بُت تراشی اور سنگ تراشی سے سجاوٹ نہ کی گئی ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عمارتوں کے طرزِ تعمیر کا حسن اس سجاوٹ کی نذر ہوگیا۔

دراصل ہندستانی معمار بہ یک وقت فنِ تعمیر، سنگ تراشی اور نقاشی تینوں کا ماہر ہوتا تھا، اس لیے وہ جب کوئی عمارت تعمیر کرتا تو تینوں فنون کا استعمال کرتا۔ اس عمل میں بعض عمارتیں خوب صورت ہو جاتیں لیکن بعض میں بھدا پن بھی پیدا ہو جاتا۔

مندروں کے طرزِ تعمیر کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:۔

1- بدھ مت طرزِ تعمیر
2- جین مت طرزِ تعمیر
3- برہمن طرزِ تعمیر

اشوک کے کچھ عرصے بعد ہندستان کا فنِ تعمیر تاریکی میں ڈوب جاتا ہے اور پھر طویل عرصے بعد ہمیں مالوہ کے راجا بکرماجیت کا پتا چلتا ہے۔ جس کا دارالسلطنت اُجین تھا۔

آگرے کے مشرق میں ایک شہر قنوج تھا۔ یہ شہر آج بھی ہے، جو فنِ تعمیر کے لحاظ سے عظیم الشان تھا۔ اس شہر کے بارے میں محمد قاسم فرشتہ نے لکھا ہے کہ:۔

''جب 1017 میں محمود غزنوی نے حملہ کیا تو اُس نے قنوج شہر کو دُور سے دیکھ کر کہا کہ یہ وہ شہر ہے کہ جس کی شہر پناہ اور عمارات آسمان سے باتیں کرتی ہیں۔ اگر یہ اپنے تئیں تمام عالم میں لاثانی خیال کرے تو بے جا نہ ہوگا۔''

ہیون سانگ نے اپنے سفرنامے میں لکھا ہے کہ قنوج کا طول ''سوا تین میل تھا۔'' ڈاکٹر گستاؤلی بان کا خیال ہے کہ: ''اُس عہد کے قنوج کا ایک پتھر بھی نہیں بچا۔ اس کا کہنا ہے کہ ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہت سی عمارات مسلمانوں کے زمانے سے قبل ہی تلف ہو گئی تھیں۔''(2)

آگے چل کر گستاؤلی بان نے متھرا شہر کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: ''جس وقت محمود غزنوی متھرا میں داخل ہوا تو اس شہر کی شان و شوکت دیکھ کر حیرت میں آ گیا وہ لکھتا ہے کہ اس عجیب و غریب شہر میں ایک ہزار سے زیادہ عمارتیں سنگِ مرمر کی ہیں، جو استحکام میں مثل دینِ اسلام کے ہیں۔ اگر ان عمارات کی لاگت کا اندازہ کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ ان کی تعمیر میں کئی کروڑ دینار صرف ہوئے ہوں گے۔ اُس کے ساتھ کا ایسا شہر دو سو سال سے کم میں تیار نہیں ہو سکتا ہے۔''(3)

شمالی ہند میں جب مسلمانوں نے دلّی پر قبضہ کر لیا تو مسجدوں اور رہائشی عمارتوں کی ضرورت پڑی۔ ان عمارتوں کی تعمیر کے لیے ہندستان کے ماہر معماروں کی خدمات حاصل کی گئیں۔ فطری طور پر ان معماروں کے ذریعے ہندستان میں مسلم فنِ تعمیر پر ابتدا ہی سے ہندو فنِ تعمیر کے گہرے اثرات مرتب ہونے شروع ہو گئے۔ اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ میں ان اثرات کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ:

''ہندستان کی کاریگری کی سب سے پہلی براہِ راست شہادت غزنہ کے غوری والی محمد بن سام کا مقبرہ ہے۔ سلطنتِ دہلی کے قیام کے ساتھ ہی ہندو فن کا اسلوب ہندستان کے مسلم فن میں نفوذ کر گیا۔ اس امر سے قطع نظر کہ پُرانے ستونوں اور دروازوں سے ابتدائی اور عجلت میں بنائی ہوئی مسجدوں کے دالانوں اور محرابوں میں کثرت سے کام لیا گیا۔ ہندو معماروں کا اشتراک ان مثالوں سے ظاہر ہے: دلی میں مسجد قوۃ الاسلام کی جالیاں اور التتمش اور سلطان غاری کے مقبروں کے آرائشی کام، علائی دروازے اور جماعت خانے درگاہ (نظام الدین) کی دیواروں کی رنگ برنگ کی پتھروں سے تزئین، غیاث الدین تغلق کے مقبرے کے چھوٹے کمرے اور حوضِ خاص کے دالان اور جھروکے۔ مقامی سلطنتوں میں کشمیر، بنگال اور گجرات کا فنِ تعمیر بڑی حد تک ان علاقوں کے ہندو اسالیب ہی سے تشکیل کیا گیا۔ سب سے پہلے شہنشاہ اکبر نے شعوری طور پر ہندی اوضاع کو اپنے وسیع المشرب فنِ تعمیر میں شامل کیا، جو اس کی ہندو مسلم اتحاد کی حکمتِ عملی کا ترجمان ہے۔''(4)

ہندستان کے مختلف علاقوں میں جو عمارتیں بنیں، اُن پر ہندو فنِ تعمیر کے بہت واضح اثرات نظر آتے ہیں۔ کلس، کنول کی شکل کے ستون، چھتیں، قبے، ہلالی محرابیں، ہندستانی فنِ تعمیر ہی سے لیے گئے ہیں۔ اٹھارھویں صدی سے تو ہندستان کا مسلم فنِ تعمیر جمالیاتی اعتبار سے بھی مکمل طور پر ہندستانی رنگ میں رنگ گیا تھا۔

حواشی:

1. تمدنِ عرب، ص۔ 474
2. اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ، جلد 15، ص۔ 758-759
3. ایضاً، ص۔ 515-516
4. بحوالہ تمدنِ ہند، ص۔ 153

□□□

جوابات: کوئز

1- ج 2- ب 3- ج 4- د 5- الف 6- ب
7- د 8- الف 9- ب 10- د 11- ج 12- الف
13- ب 14- ج 15- الف 16- د 17- ب 18- ج
19- د 20- ب 21- الف 22- ج 23- د 24- الف
25- ب 26- ج 27- د 28- الف 29- ب 30- ج
31- د 32- الف 33- الف 34- ب 35- ج 36- ج
37- ج 38- ب 39- الف 40- الف 41- ب 42- الف
43- د 44- ج 45- ب 46- الف 47- ج 48- ب
49- ج 50- ب

وہاب قیصر　　　　ہماری مطبوعات　　　　("مولانا آزاد کی سائنسی بصیرت" سے اقتباس)

مولانا آزاد اور ملک میں سائنس کی ترقی

کسی ملک کی آزادی کے بعد اس کی ترقی کا دارومدار رہنماؤں کی فکرونظر اور بصیرت پر ہوتا ہے۔ خاص کر ابتدائی دس بارہ سال کا عرصہ تو بڑا ہی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ ارباب اقتدار اس دور میں ملک اور قوم کو جس راہ پر گامزن کریں گے وہ اسی راہ پر چل پڑیں گے۔ مستقبل کے تقاضوں کے پیش نظر جس طرح کے اقدامات کیے جائیں گے، جس قسم کے منصوبے بنائے جائیں گے اور جتنی تیزی کے ساتھ انھیں روبہ عمل لایا جائے گا، ملک اتنی ہی تیزی کے ساتھ ترقی کرے گا۔

ہمارے ملک کی آزادی سے قبل ہی ستمبر 1946 میں عبوری حکومت کا قیام عمل میں آیا۔ ابتدا میں مولانا ابوالکلام آزاد اس حکومت میں شامل نہیں تھے۔ وزیراعظم جواہر لعل نہرو کے اصرار پر 15 جنوری 1947 کو وہ وزارت میں شامل ہوئے اور مہاتما گاندھی کے مشورے پر انھوں نے وزیر تعلیم کا قلمدان سنبھالا۔ بعد میں سائنس اور کلچر کی زائد ذمے داری بھی انھیں سونپی گئی۔ 1952 میں جب پہلے عام انتخابات عمل میں آئے تو اس کے بعد مولانا آزاد وزیر تعلیم، قدرتی وسائل اور سائنسی تحقیقات مقرر ہوئے۔ 1957 کے دوسرے عام انتخابات کے بعد انھوں نے دوبارہ وزیر تعلیم اور سائنسی تحقیقات کی وزارت کا قلمدان سنبھالا۔ اس وزارت پر وہ 22 فروری 1958 میں اپنی وفات تک قائم رہے۔

آزادی کے فوراً بعد گاندھی جی اس جہانِ فانی سے رخصت ہوگئے اور اس کے دو سال بعد سردار پٹیل بھی چل بسے۔ چنانچہ ملک کے پہلے وزیراعظم کو نئی قوم کے لیے تعمیری اور ترقیاتی منصوبوں کی تدوین اور ان کی تکمیل کے لیے قوانین وضوابط کی ترتیب میں مولانا آزاد کے مشوروں کی ہمیشہ ضرورت رہی۔ جب بھی زمانے کو عصر حاضر سے مربوط کرنے اور سماج کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی بات کی جاتی ہے وہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے حوالے کے بغیر مکمل متصور نہیں ہوتی۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ آزاد ہند کی تعمیر میں اس کے پہلے وزیراعظم اور وزیر تعلیم وسائنس، سائنس کی ترقی وٹیکنالوجی کے فروغ کو اور ان علوم میں اعلا تعلیم کو اہمیت دیے بغیر ملک کے لیے منصوبے بناتے۔

تاریخی شواہد یہ ظاہر کرتے ہیں کہ انیسویں صدی کی ابتدا میں ہندستان میں جدید تعلیم کی شروعات کے نتیجے میں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں سائنس کی تعلیم کو فروغ حاصل ہوا۔ اس کے باوجود ایک طویل عرصے تک یہاں سائنس کے تحقیقی کاموں کے لیے بہت کم ہمت افزائی کی گئی۔ 1876 میں Indian Association for Cultivation of Sciences کلکتہ میں قائم کیا گیا جس میں مہندر لال سرکار کی ذاتی دلچسپی اور انفرادی کاوش کو بڑا دخل تھا۔ جمشید جی ٹاٹا کی فراخدلی اور بصیرت کی وجہ سے 1911 میں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس، بنگلور قائم ہوسکا۔ جگدیش چندر بوس کی سائنس میں بے لوث خدمت کی بدولت 1917 میں بوس ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کلکتہ کا قیام عمل میں آیا۔ ان اداروں کے قیام نے یونیورسٹیوں میں سائنس کی تحقیق کے لیے راہیں ہموار کیں اور سائنس کے مختلف شعبوں میں تحقیق کے لیے رہنمائی کی۔ سائنس کی تحقیق کے پیچھے بنیادی مقصد علم کا حصول اور اس کا فروغ تھا۔ مختلف صنعتوں اور صنعتی اداروں کے قیام میں نہ ہی کوئی دلچسپی تھی اور نہ کسی نے ان سے استفادہ حاصل کیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی گیارہ سالہ دور وزارت ہندستان کی تعلیمی ارتقا کی تاریخ میں نہایت اہمیت رکھتی ہے۔ فنی تعلیم کی کل ہند مجلس کی تنظیم جدید، یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کا قیام، کونسل فار سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ CSIR کا تحرک اور اس کے تحت سائنسی تحقیقات کے قومی اداروں کا قیام، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس کی تیزی کے ساتھ ترقی جیسے اہم امور اسی دور میں انجام پائے۔ اسی اثنا میں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس نے سائنس و ٹیکنالوجی کی اعلا تعلیم وتحقیق کے ایک مرکز کی حیثیت اختیار کی۔ اس ادارے میں ہوابازی سے متعلق ایروناٹیکل انجینئرنگ، اندرونی احتراق سے متعلق

● مولانا ابوالکلام آزاد جدید ہندستان کے معماروں میں سے ایک تھے۔ ان کے سیاسی تدبر، علمی فتوحات اور صحافتی خدمات پر کافی کچھ لکھا گیا ہے۔ کم ہی لوگوں کو معلوم ہے کہ انھیں سائنس سے بھی بے حد لگاؤ تھا اور انھوں نے آزادی کے بعد بطور وزیر تعلیم اور سائنسی تحقیقات ملک کو سائنس اور ٹیکنالوجیکل ترقی کی راہ پر گامزن کیا۔ اس کتاب میں مولانا آزاد کی سائنسی بصیرت پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ 180 صفحات کی اس کتاب کی قیمت 100 روپے ہے۔ قومی اردو کونسل اپنی مطبوعات پر طلبہ اور اساتذہ کو 40فیصد کی خصوصی رعایت دیتی ہے۔

Internal Combustion Engineering، خام دھاتوں کو صاف کرنے سے متعلق Metallurgy اور کیمیاوی اشیا سے متعلق Chemical Enginnering میں خاص طور پر توجہ دی گئی۔ بعد میں یہاں ہائی وولٹیج انجینئرنگ اور پاور انجینئرنگ کے شعبے بھی قائم کیے گئے۔

ہندستان میں تحریک آزادی کے دور کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ یہاں چند برطانوی اساتذہ اور سائنس دانوں نے سائنس میں تحقیقات کی غرض سے انفرااسٹرکچر تیار کیا اور چند تحقیقی مراکز بھی قائم کیے۔ ان کے علاوہ قومی جذبہ رکھنے والے چند ہندستانی ماہرین، سائنس کی تحقیق میں منہمک ہوگئے اور صنعتوں کا قیام بھی عمل میں لے آئے۔ ان صنعتوں میں لوہا اور اسٹیل کی بنیادی صنعتیں اور روزمرہ استعمال کی اشیا کی صنعتیں جیسے ٹکسٹائل اور دواؤں کی صنعتیں قابل ذکر ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے اختتام پر دنیا بھر میں سائنس کافی وسعت اختیار کر چکی تھی۔ نیوکلیر سائنس، راڈار، Antibiotics جیسے سائنس کے نئے میدانوں میں خاطرخواہ کامیابیاں حاصل ہو رہی تھیں۔ جب کہ ملک کی آزادی کے بعد پنڈت نہرو کی رہنمائی اور مولانا آزاد کی وزارت میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے لیے ملک کی پالیسی اہم آلہ کا درجہ اختیار کررہی تھی۔

مولانا آزاد نے اپنی عملی زندگی کی شروعات ایک صحافی کی حیثیت سے کی، جس میں مسلمانوں کے سیاسی شعور کو بیدار کرنے، تحریک آزادی میں ہم وطنوں کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر چلنے اور آزاد ہندستان کی اہمیت اور اس کے تصور کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ ان میں سائنسی فکرونظر کو عام کرنے، انھیں توہم پرستی سے چھٹکارہ دلانے، سائنس کی تعلیم کے حصول کی ترغیب دینے اور سائنسی علوم کو فروغ دینے کے لیے خدمات انجام دیں۔ ان میں بیشتر امور کی عملی طور پر انجام دہی کے لیے وزارت تعلیم وسائنس کا قلمدان بہت معاون ثابت ہوا۔ اس طرح مولانا نے ملک میں ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلا تعلیم تک بشمول سائنس، ٹیکنالوجی وفنی تعلیم) کے حصول کا اہتمام کیا۔ سائنسی تحقیقات اور ٹکنالوجی کے فروغ کے لیے درکار پروگرام اور منصوبے بنائے اور انھیں تکمیل کو پہنچانے کے لیے کئی سائنسی، صنعتی، تحقیقی وتربیتی اداروں کا قیام عمل میں لائے جن میں انفراسٹرکچر اور دیگر سہولتوں کی فراہمی کو اولین فوقیت حاصل رہی۔

مولانا آزاد کو شدت سے اس بات کا احساس تھا کہ فنی تعلیم کے بغیر ملک میں صنعتی ترقی نہیں ہوسکتی اور معاشی ترقی کی رفتار میں اضافہ مقصود ہو تو فنی تعلیم میں توسیع بے حد ضروری ہے۔ مولانا ان باتوں کا اظہار تعلیم سے متعلق اپنی بیشتر تقریروں میں کر چکے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے 1951 میں اپنے ایک خطاب میں فنی تعلیم سے متعلق کچھ اس طرح اظہار خیال کیا ہے:

''وزارت تعلیمات کا جائزہ حاصل کرتے ہی پہلا فیصلہ جو میں نے کیا وہ یہ تھا کہ ملک میں اعلا فنی تعلیم کے حصول کے لیے سہولتیں فراہم کی جائیں تاکہ خود ہم اپنی اکثر ضرورتوں کو پورا کرسکیں، ہمارے نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد اعلا تعلیم کے حصول کے لیے جو ملک سے باہر جاتی تھی خود ملک میں یہ تعلیم حاصل کرسکتی ہے۔ میں اس دن کا منتظر تھا اور اب بھی ہوں جب ہندستان میں فنی تعلیم کی سطح اتنی بلند ہوجائے کہ باہر سے لوگ ہندستان اس غرض سے آئیں گے کہ یہاں اعلا سائنس اور فنی تعلیم وتربیت حاصل کریں۔''
(کتاب التذکرہ۔ ہمایوں کبیر۔ ص-131)

1947 کی ابتدا میں حکومت ہند نے Scientific Manpower Committee قائم کی اور ملک کے حرکیاتی سائنس داں ڈاکٹر ایس ایس بھٹناگر کو اس کا صدر مقرر کیا۔ اس کمیٹی کو اس بات کا اندازہ لگانا تھا کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی تحقیق کے میدان میں 1947 سے 1957 تک ملک کو کتنے فنی عملے کی ضرورت پیش آئے گی اور اس مقصد کے حصول کے لیے کیا تدابیر اختیار کی جائیں۔ اس کمیٹی نے ایک پنج سالہ منصوبے کی سفارش کی اور چند تجاویز پیش کیں جن میں سے چند اہم تجاویز یہ تھیں:

1- سائنس اور ٹیکنالوجی کے وہ شعبے جن پر اس وقت تک کام نہیں ہوا تھا ان کے لیے مخصوص نصاب کی تیاری اور اس کی تعلیم اور تحقیق کا انتظام۔
2- موجودہ اداروں میں حسب گنجائش تعلیم وتحقیق کے امور میں توسیع۔
3- ملک میں موجود پالی ٹکنکس میں اعلا تعلیم کا انتظام۔
4- فنی عملے کے نگراں کاروں کی صنعت وحرفت کے ساتھ تربیت۔
5- منتخب اداروں میں منطقہ واری اساس پر پروڈکشن انجینئرنگ اور ڈیزائن انجینئرنگ کی تعلیم کے لیے سہولتوں کی فراہمی۔
6- فنی اداروں میں تعلیم حاصل کرنے والوں کے لیے تعلیم کے اختتام پر عملی تعلیم وتربیت کے حصول کا انتظام۔

ان تجاویز کو روبہ عمل لایا گیا جس کے نتیجے میں فنی تعلیم کی سہولتوں میں کافی اضافہ ہوا اور اس کے حصول کی نئی راہیں کھل گئیں۔ قومی رہنماؤں اور وزارت تعلیم کے لیے ایک بہت ہی اہم مسئلہ یہ درپیش تھا کہ آزادی کے بعد یونیورسٹیوں میں ذریعۂ تعلیم کیا ہو؟ اس پر بڑے غوروخوض کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ انگریزی ذریعۂ تعلیم کو یکایک اعلا تعلیم کے لیے ختم نہیں کیا جانا چاہیے بلکہ اس کو مزید پانچ سال تک برقرار رکھا جائے اور اس کے بعد آہستہ آہستہ ہندستان کی کسی زبان کو ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے اختیار کیا جائے۔ لیکن اس میں ایک اہم مسئلہ علوم کے لیے اصطلاحوں کا درکار تھا جس کے لیے

Central Advisory Board نے ایک حل تلاش کرنے کی کوشش کی۔ اس کے لحاظ سے چونکہ انگریزی میں سائنسی اصطلاحات بین الاقوامی معیارات کی ہوتی ہیں اس لیے ان کو ترجمے کے بغیر جوں کا توں استعمال کیا جانا چاہیے خواہ یونیورسٹی سطح پر تعلیم کسی بھی ہندستانی زبان میں کیوں نہ دی جائے۔ پانچ سال بعد انگریزی ذریعۂ تعلیم کو جاری رکھنے کے فیصلے کو مزید پانچ سال تک کی توسیع دی گئی۔ جس کی مدت بڑھتی ہی گئی۔

مولانا آزاد کا یہ ماننا تھا کہ پنج سالہ منصوبے کا مقصد صرف زرعی پیداوار، صنعت وحرفت، بجلی، ذرائع آمدورفت اور دوسرے زمروں میں ترقی کرنا ہی نہیں ہے بلکہ اس میں یہ خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ اہل ملک اور نئی نسل کی ذہنی تربیت صحیح طور پر ہو، تاکہ انھیں اچھے شہری بننے کا موقع مل سکے، وہ یہ جانتے تھے اور اس کا اظہار بھی کیا کرتے تھے کہ ملک میں سائنسی یا دوسری قسم کی استعداد کی کوئی کمی نہیں۔ صرف یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ اس کو کس طرح بروئے کار لایا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ سائنسی اور تکنیکی تعلیم کی طرف ان کا دھیان ہر وقت مبذول رہتا تھا۔ 1950 میں مولانا نے سنٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن کی میٹنگ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

''فنی تعلیم کے معیار کو بہتر بنانے کے لیے جو لائحۂ عمل ہمارے پیش نظر تھا وہ چار اعلا حرفیاتی اداروں کا قیام نیز موجودہ اداروں کی تقویت تھی۔ مالیہ نے اجازت نہیں دی کہ ہم چاروں کا ایک ساتھ قیام عمل میں لائیں، لیکن ہم نے سوچا کہ کام کی ابتدا تو کی جانی ضروری ہے۔ اس لیے بغیر تمام ضروری عمارتوں کی تعمیر کا انتظار کیے کلکتہ سے قریب مشرقی اعلا حرفیاتی ادارہ قائم کیا گیا۔ ابھی کام ہو رہا ہے اور مجھے امید ہے کہ آئندہ تعلیمی سال میں ہم اساتذہ وطلبہ کے پہلے گروہ کو اس ادارے میں کام کرتا پائیں گے۔ ساتھ ہی ساتھ ہمارا مقصد یہ بھی ہے کہ موجودہ اداروں کی حالت کو بہتر بنائیں اور ان کی کارکردگی کی صلاحیت میں اضافہ کریں۔''

(کتاب التذکرہ۔ ہمایوں کبیر۔ ص 127)

اعلا فنی تعلیم اور تربیت کے لیے مولانا آزاد کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے 1951 میں کھڑک پور انسٹی ٹیوٹ آف ہائیر ٹیکنالوجی کے قیام کو عملی شکل دی جس نے بعد میں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی IIT کھڑک پور کے نام سے ملک بھر میں شہرت حاصل کی۔ 1950 میں حکومت بنگال نے صنعتی ادارے کی تعمیر کے لیے کھڑک پور میں وزارت تعلیمات کو بارہ سو ایکڑ زمین پیش کی۔ اس ادارے کی ابتدا دو سو طالب علموں کے داخلے سے ہوئی جنھیں تین ہزار درخواستگاروں میں سے چنا گیا تھا۔ یہ ادارہ ایک سال کے عرصے میں مزید ترقی کی طرف گامزن ہوا۔ انجینئرنگ کے بنیادی کورسز میں داخلوں کے ساتھ اس میں نیول آرکیٹکچر، اگریکلچرل انجینئرنگ اور آرکیٹکچر کی ڈگریوں کے لیے داخلہ دیا گیا۔ پروڈکشن انجینئرنگ اور Combustion Engineering میں پوسٹ گریجویشن کورسز بھی شروع کیے گئے۔ چند طلبہ نے انجینئرنگ کے کئی میدانوں میں تحقیق کی غرض سے داخلہ لیا۔ اس ادارے نے Management Studies میں مختصر مدتی کورس بھی شروع کیا جو ان دنوں سارے ایشیا میں اپنی نوعیت کا واحد کورس رہا۔ اس کورس میں صنعت، کامرس، سرکاری محکموں اور دوسرے اداروں سے وابستہ لوگوں نے داخلہ لیا اور کارگر ایڈمنسٹریشن کے مشترکہ اصولوں کی جانکاری حاصل کی۔ اس ادارے میں طلبہ کی جملہ تعداد بڑھ کر سات سو ہو چکی تھی اور مزید ایک سال بعد ایک ہزار طلبہ نے اس میں داخلہ لیا۔ اس طرح مولانا آزاد کے دور وزارت میں قائم کیا گیا ایک چھوٹا سا ادارہ آگے چل کر بہت بڑے ادارے کی صورت اختیار کرتا گیا۔

کونسل فار سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ CSIR کا قیام 1942 میں عمل میں آیا تھا۔ لیکن اس کے توسیعی کام 1949 سے شروع ہوئے۔ پنڈت نہرو بحیثیت وزیراعظم اس کے صدر اور مولانا آزاد بحیثیت وزیر تعلیم وسائنس اس کے نائب صدر مقرر ہوئے۔ پنڈت نہرو بحیثیت صدر CSIR کی تمام ترقی کے ذمے دار تھے۔ مولانا آزاد اس کے روزمرّہ معمولات کے نگراں ہونے کے علاوہ اس کے طویل مدتی منصوبوں میں شریک رہے۔ مولانا نے CSIR کے لیے سائنس کے انفرااسٹرکچر کی ترقی کو جو سمت بخشی تھی وہ لائق تحسین ہے۔ بقول مولانا آزاد'' وہ CSIR کے امور میں بحیثیت وزیر نہیں بلکہ بحیثیت آفس بیرر کے شامل رہتے تھے۔'' قوم کی ترقی میں سائنس کے اہم رول کے بارے میں مولانا آزاد کے خیالات بالکل واضح تھے۔ وہ اپنے ملک کے سائنسی ماہرین کو اس بات کی تلقین کرتے ہیں کہ سائنسی علوم کو سماجی ترقی کے لیے بروئے کار لائیں اور اس بات کا احتیاط دیتے ہیں کہ وہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی دریافتوں اور ایجادات کے انسانیت سوز استعمال سے باز رہیں۔

مولانا آزاد 1952 میں سنٹرل روڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے افتتاح کے موقع پر اپنے خطاب میں آزادی کے بعد ملک میں سائنس کی ترقی، ٹیکنالوجی کے فروغ اور تکنیکی تعلیم کا جائزہ لیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ اس عرصے میں تکنیکی تعلیم کی فراہمی میں بہت بڑی ترقی ہوئی۔ آل انڈیا کونسل برائے ٹیکنیکل ایجوکیشن اور سائنٹفک مین پاور کمیٹی کی سفارشات کو روبہ عمل لاتے ہوئے یونیورسٹیوں اور دیگر اعلا فنی اداروں کو تعلیم اور تحقیق کے لیے فراخدلانہ طور پر گرانٹ منظور کی گئی۔ ڈیولپمنٹ پروگرام کے پہلے مرحلے میں ملک کے مختلف حصوں میں چودہ تکنیکی اداروں کا قیام عمل میں لایا گیا۔ انڈین انسٹی

ٹیوٹ آف سائنس بنگلور کو وافر مقدار میں جاری کی گئی گرانٹ کے نتیجے میں اس کے موقف میں نمایاں تبدیلی آئی اور اس کے تحت سائنس اور ٹیکنالوجی کے کئی بنیادی شعبوں میں پوسٹ گریجویٹ سطح کی تعلیم اور تحقیق کو بروئے کار لایا جاسکا۔ دہلی پالی ٹکنیک کی ترقی اس حد تک عمل میں آئی کہ وہ دہلی یونیورسٹی کے لیے ٹکنالوجی کے شعبے کی حیثیت سے خدمات انجام دے سکے۔ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کھڑک پور انجینئرنگ وٹکنالوجی کے شعبے میں تحقیق و تدریس کی اعلا سہولتیں فراہم کی گئیں۔ مولانا کو اس بات کی قوی امید تھی کہ مستقبل میں یہ ادارہ ملک میں اعلا تکنیکی تعلیم اور تحقیق میں ترقی کے لیے ایک سنگ میل ثابت ہوگا۔

ابتدائی پانچ برسوں میں سائنس کی ترقی کے لیے فراہم کی گئی سہولتوں کا احاطہ کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں کہ کونسل آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ کو اس لیے قائم کیا گیا تھا کہ جنگ کے لیے درکار ذرائع بڑھائے جاسکیں۔ لیکن ملک میں قومی حکومت کے قیام کے بعد اس کے فرائض امور میں وسعت دی گئی اور اس میں قومی زندگی اور ترقی کے تمام پہلوؤں کو شامل کیا گیا۔ اس عرصے میں نہ صرف اس کے دائرۂ کار میں وسعت آئی بلکہ سائنسی تحقیق کے نت نئے شعبوں کا اضافہ بھی ہوا۔

ملک میں تیز تر ذرائع حمل ونقل کے لیے درکار سڑکوں پر تحقیق کی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ کیونکہ بغیر مناسب رسل و رسائل کے زراعت، انڈسٹریز اور کامرس کو ترقی نہیں دی جاسکتی۔ مولانا کا یہ ماننا تھا کہ زرعی پیداوار کی بڑھتی ہوئی مانگ کی بدولت مناسب ذرائع ترسیل کے بغیر نہ تو دیہاتوں کے لیے ضروری زرعی آلات، کھاد اور سائنسی وتکنیکی جانکاری فراہم کی جاسکتی ہے اور نہ ہی ایک دیہات سے دوسرے ضرورت مند دیہات تک غلہ اناج پہنچایا جاسکتا ہے۔ 1950 تک آزاد ہندستان میں موٹر گاڑیوں کی کل تعداد تین لاکھ بھی نہ تھی جبکہ برطانیہ میں ان کی تعداد 44 لاکھ اور امریکہ میں تقریباً پانچ کروڑ گاڑیاں موجود تھیں۔ آمدورفت کے لیے دستیاب سڑکوں کا تناسب بھی کچھ اچھا نہیں تھا۔ فی ہزار آبادی کے لیے چھ فرلانگ لمبی سڑک بھی میسر نہیں تھی۔ برطانیہ میں فی ہزار آبادی پر 3.6 میل لمبی سڑک اور امریکہ میں فی ہزار آبادی پر 21 میل لمبی سڑک دستیاب تھی۔ یہی وجہ رہی کہ ملک کے لیے قابل اطمینان سڑکوں کے نظام، ان کی تعمیر سے متعلق مسائل، اقل ترین خرچ پر سڑکوں کی دیکھ بھال اور دیہی علاقوں میں سڑکوں کی تعمیر اور ان پر گاڑیوں کے استعمال کے مطالعے کے لیے ایک تحقیقی ادارے کی ضرورت محسوس کی گئی اور اس کی تکمیل کے لیے سنٹرل روڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ CRRI کا قیام عمل میں لایا گیا اس تحقیقی ادارے کا افتتاح مولانا آزاد کے ہاتھوں 16 جولائی 1952 کو عمل میں آیا۔ اس ادارے نے کم لاگتی سڑکوں کی تعمیر، ان کی دیکھ بھال اور ان کی ترقی کو فوقیت دیتے ہوئے درج ذیل امور پر توجہ مرکوز کی۔

1) سڑکوں کی تعمیر اور ان کی مضبوطی کے لیے تحقیق۔

2) روڈ میٹیریل، تعمیر اور سڑکوں کی اصلی حالت میں برقراری کے لیے بنیادی اور اطلاقی تحقیق۔

3) سڑکوں کے معیارات کے لیے خصوصی جانچ کے پیمانوں کا قیام۔

4) سڑکوں کی مختلف امتحانی جانچ کے لیے مناسب آلہ جات کی ایجاد۔

5) مٹی کی میکانیات (Soil Mechanics) اور مٹی کی جانچ کے لیے مطالعہ، تاکہ دیہی سڑکوں کو تمام موسمی حالات میں استعمال کے قابل بنایا جاسکے۔

6) ٹریفک کی مختلف حالتوں میں مختلف قسموں کی سڑکوں کی خصوصیات اور ان کی حالت کا مطالعہ۔

7) اتفاقی حادثات، سڑک کے اعداد وشمار اور حفاظتی آلات کی تیاری۔

اس ادارے کے علاوہ CSIR کے تحت عمارتوں کی تعمیر اور تحقیق کے لیے بھی ایک ادارے کا قیام عمل میں لایا گیا جو سنٹرل بلڈنگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ CBRI کہلایا۔

سنٹرل بلڈنگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کو 1953 میں روڑکی میں قائم کیا گیا۔ اس ادارے کا افتتاح مولانا آزاد کے ہاتھوں 12 اپریل 1953 کو عمل میں آیا جو CSIR کے تحت پہلے پنج سالہ منصوبہ میں قائم ہونے والی گیارہ قومی لیباریٹریوں میں سے آخری لیباریٹری تھی۔ آزادی کے ابتدائی پانچ سال میں ان لیباریٹریوں کا قیام ہندستان کی صنعتی ترقی کی تاریخ میں ایک سنگ میل ثابت ہوا۔ ہمارے ملک کی قومی صنعتوں کے ارتقا اور فروغ میں سائنس اور ٹیکنالوجی کو بروئے کار لانے کی یہ پہلی باقاعدہ اور منصوبہ بند کوشش تھی۔

سنٹرل بلڈنگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کو CSIR کے تحت تشکیل کردہ بلڈنگ ریسرچ کمیٹی کی سفارشات پر قائم کیا گیا۔ اس کی شروعات تھامسن کالج آف انجینئرنگ کے تعاون سے بلڈنگ ریسرچ یونٹ کے سیٹ اپ کے ساتھ ہوئی جو بعد میں ٹکنیکل یونیورسٹی آف روڑکی کہلائی۔ جس کی بلڈنگ کا سنگ بنیاد فروری 1951 میں رکھا گیا تھا۔

اس ادارے میں کی جانے والی تحقیقات میں سے چند تحقیقات خصوصی طور پر ملکی ضروریات کا احاطہ کرتی تھیں۔ یہ ادارہ منطقہ حارہ کی Tropical Conditions کے لیے آرام دہ مکانات کی تعمیری ضروریات، مٹی میں مضبوطی اور استحکام کا مطالعہ، دیسی میٹیریل کا استعمال، صنعتی فضلہ کو کارآمد بنا کر اس کو استعمال میں لے آنا۔ کم آمدنی والے مکینوں کے لیے بڑے پیمانے پر

مکانوں کی تعمیر جیسے مسائل پر خاص توجہ دینے کا مجاز تھا۔ ان مسائل سے نمٹنے کے لیے سنٹرل بلڈنگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کو ذیل کے چار اہم زمروں کے تحت تحقیق ذمّے داری سونپی گئی۔

1) بلڈنگ میٹریل
2) تعمیر کے طریقے
3) عمارتوں میں قیام کی صلاحیت
4) سروے اور اطلاعات

اس ادارے میں ایسے ڈیویژن قائم کیے گئے جو بلڈنگ میٹریلس کی تیاری اور جانچ کر سکیں۔ اس ادارے کی یہ بھی ذمّے داری رہی کہ وہ کیمسٹری، آرکیٹکچرل فزکس اور انجینئرنگ کے ڈیویژنوں کے لیے سائنسی اور تکنیکی جانکاری فراہم کرے۔

ہندستان میں جدید سائنسی تحقیقات کو روبہ عمل لانے اور ملک کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے CSIR کے تحت ایک ادارہ ''الکٹرانک انجینئرنگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ'' قائم کیا گیا جس کا سنگ بنیاد مولانا آزاد کی موجودگی میں ملک کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو نے 21 ستمبر 1953 کو رکھا تھا۔ اس ادارے کے قیام سے ملک میں قومی اداروں کی تعداد 12 تک پہنچ چکی تھی۔ سنگ بنیاد کے موقع پر مولانا آزاد نے اپنے خطاب میں الکٹرانکس کی تحقیق اور ترقی پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا تھا کہ دوسری جنگ عظیم کے دوران دنیا نے الکٹرانکس کے شعبے میں کافی حد تک ترقی کر لی تھی۔ یہ محسوس کیا گیا کہ دنیا میں کوئی صنعت اور سائنس کا کوئی شعبہ ایسا نہیں تھا جس میں الکٹرانکس کے آلات سے استفادہ نہ کیا گیا ہو۔ الکٹرانکس کی تحقیق ہی راڈار کی ایجاد کا موجب بنی جس کے ذریعے جنگ عظیم کے دوران دشمن کے ہوائی جہازوں اور آب دوزوں کی نقل و حرکت پر نظر رکھی جا سکی۔ الکٹرانکس مشینوں کے ذریعے مشکل ترین مساواتوں کو بہ آسانی حل کرتے ہوئے انسانی وقت اور محنت کو رائیگاں ہونے سے بچایا جا سکا۔ کئی ایک مسائل کے حل کے لیے ماہرین ریاضی کو جہاں کئی سال درکار ہوتے وہیں ان مشینوں نے صرف چند گھنٹوں میں انھیں حل کر دیے۔ صنعتوں میں دھاتوں کو پگھلانے کے لیے ان میں تپش پیدا کرنے کے لیے پلاسٹکس کو گرم کرنے اور کیمیائی تعاملات کو کنٹرول کرنے کے لیے الکٹرانکس آلات مددگار ثابت ہوئے۔ ریڈیائی مواصلات اور ٹیلی ویژن کے لیے آواز اور تصویروں کی ترسیل میں الکٹرانکس کی تحقیق کارگر ثابت ہوئی ہے۔

دوسرے ملکوں میں الکٹرانکس کی ترقی کے مقابلے میں ہمارے ملک میں برائے نام کام ہوا تھا۔ کلکتہ یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ آف الکٹرانکس، نیشنل فزیکل لیبارٹری نئی دہلی اور ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ آف فنڈامنٹل ریسرچ ممبئی، وہ ادارے تھے جہاں ریڈیو اور الکٹرانکس پر تحقیق جاری تھی۔ اس بات کا شدید احساس تھا کہ یہ تین ادارے ملک کے لیے درکار الکٹرانکس کی سہولتوں کی فراہمی اور ضروریات کی تکمیل کے لیے کافی نہیں ہو سکتے۔ اس لیے ایک ایسے ادارے کی ضرورت محسوس کی گئی جو ان تمام امور کی بجاآوری کر سکے۔ تحقیقات سے یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ دیسی میٹریل کے استعمال سے ریڈیو کے لیے کل پرزوں کی تیاری کا کام انجام دیا جا سکتا ہے۔ لیکن بڑے پیمانے پر یہ کام اسی وقت تکمیل کو پہنچ سکتا تھا جب ملک کا کوئی قومی ادارہ اس میدان میں تحقیقی کام کے لیے مخصوص ہو۔ چنانچہ نامور ماہرین کی خدمات سے استفادہ کیا گیا اور سنٹرل الکٹرانکس انجینئرنگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پلانی (راجستھان) کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس ادارے کے مقاصد میں دیسی خام میٹریل کو استعمال میں لاکر معیاری اور قابل بھروسہ الکٹرانکس کے پرزوں کی تیاری، الکٹرانکس سرکٹس کو استعمال کرتے ہوئے ملک کی صنعتوں کی کارکردگی کو ترقی دینا، مختلف پیداواری اشیا کی جانچ کے لیے معیاری الکٹرانکس آلات بنانا، خاص قسم کے ریڈیائی سرکٹس کی ترقی، میڈیکل پروفیشن کے لیے الکٹرانکس آلات کی ترقی اور تیاری، مواصلات، راڈار اور دوسرے آلات کے لیے تجربات عمل میں لانا، صوتی آلات کی ترقی و تیاری اور الکٹرانکس کو صنعتوں میں استعمال میں لانا شامل تھا۔ ان تمام مقاصد کی برآری کے لیے اس ادارے کو ذیل کے ڈیویژنوں میں تقسیم کیا گیا۔

1) الکٹرانکس سرکٹس (Electronic Circuits)
2) مواصلاتی آلات (Communication Equipment)
3) صنعتی الکٹرانکس (Industrial Electronics)
4) الکٹرانک پرزے (Electronic Components)
5) حررداني والوز (Thermoionic Valves)
6) الکٹرانک آلات (Electronic Instruments)
7) طبی آلات (Medical Apparatus)
8) صوتی آڈیو آلات (Acoustic-Audio Equipments)
9) تھیٹر اور اسٹوڈیو آلات (Theatre and Studio Equipments)
10) بہت زیادہ فریکونسی والے آلات (Very high frequency Equipments)

اس طرح مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی وزارت کے گیارہ سالہ دور میں سائنس کی تحقیق و ترقی، ٹکنالوجی اور تکنیکی تعلیم کی اشاعت اور فروغ کے لیے متعدد اقدامات کیے اور ان میدانوں میں ملک کی ترقی کے لیے نئی سمتیں متعین کیں۔

□□□

سلمان عابد

تعلیم اور روزگار کے لیے

2005 میں مسابقتی امتحانات

اکیسویں صدی علم کی بھی ہے اور اعلا روزگار کی بھی۔ اس مدت میں گذشتہ برسوں کی طرح صرف حصولِ علم پر زور نہیں دیا جائے گا بلکہ قابلیت، لیاقت اور واقعی صلاحیت اور امتیازی صلاحیت پر بھی زور دیا جائے گا۔ گذشتہ صدی کے ابتدائی دہوں میں جامعات، ادارے اور ان کی اسناد پر زور دیا گیا لیکن رفتہ رفتہ جامعاتی ماحول میں مختلف مفادات کا غلبہ ہونے لگا تو پھر صلاحیتوں پر زور دیا جانے لگا اور آج اکیسویں صدی کے ان ابتدائی برسوں میں کسی بھی یونیورسٹی یا ادارے کی سند صرف مقام انٹرویو تک لے جانے میں معاون بھی جلد ہی ہے اور حصول روزگار کے لیے امیدوار کی اصل قابلیت، صلاحیت اور لیاقت کو پرکھا جارہا ہے۔ اس موقعے پر امیدوار کی صلاحیت کو ملازمت کے تقاضوں اور دیگر امیدواروں کی صلاحیتوں کے پیشِ نظر جانچا اور پرکھا جارہا ہے۔ اکیسویں صدی میں جیسے جیسے ہم آگے بڑھتے جائیں گے صلاحیتوں کو جانچنے کا یہ میزان سخت تر اور اونچا ہوتا جائے گا۔ اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ آج ہم اپنے آپ کو نہ صرف کسی بھی روزگار یا ملازمت کے تقاضوں کے عین مطابق تیار کریں بلکہ اس ملازمت کے سینکڑوں امیدواروں سے سبقت لے جانے اور بازی مار لینے کی حد تک تیار رہوں۔

حکومتِ ہند نے مختلف اعلا عہدوں اور یہاں تک کہ ہر ایک عہدے کے لیے مسابقتی امتحان رائج رکھے ہیں۔ مرکزی حکومت کے تمام تر شعبوں اور محکموں کی تمام اسامیوں پر تقررات کے لیے حکومت نے دو ادارے قائم کیے ہیں۔

1- یونین پبلک سروس کمیشن (UPSC)

2- اسٹاف سلیکشن کمیشن (SSC)

مرکزی حکومت کے جتنے اعلا ترین عہدے ہیں جیسے IPS IAS وغیرہ۔ ان تمام پر تقررات کے لیے یو پی ایس سی مختلف سطحوں کے امتحانات منعقد کرتی ہے اور جس قدر دیگر ماتحت عہدے ہیں ان پر تقررات کی ذمے داری ایس ایس سی کو سونپی گئی ہے۔ سال بھر مختلف تاریخوں میں اور مقررہ تاریخوں میں یہ امتحان ملک کے مختلف مقامات پر منعقد کیے جاتے ہیں۔

ان امتحانات میں شرکت کے لیے کم از کم تعلیمی قابلیت دسویں جماعت ہے اور زیادہ سے زیادہ تعلیمی قابلیت ڈگری یا گریجویشن ہے۔ اسٹاف سلیکشن کمیشن کے کئی امتحان ایسے ہیں جن میں دسویں جماعت کے بعد شرکت کی جاسکتی ہے اور یہ تمام کے تمام ملازمت کے لیے ہوتے ہیں۔ جب کہ یونین پبلک سروس کمیشن کے چند ایک امتحان روزگار کے لیے اور کسی اعلا تعلیم کے لیے ہوتے ہیں۔ مگر ان میں بھی بیشتر ایسے ہیں جو پہلے تعلیم اور پھر روزگار سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں یعنی حصول علم کے لیے ان کا انتخاب کیا جاتا ہے اور ان طلبہ کو مخصوص شعبوں میں مہارت کے لیے تعلیم و تربیت فراہم کی جاتی ہے اور پھر کامیاب تکمیل کے بعد ان محکموں میں بہ حیثیت ملازم ان کا انتخاب عمل میں لایا جاتا ہے جیسے نیشنل ڈیفنس اکادمی (NDA) کے امتحانات ہیں جن میں بارھویں جماعت کامیاب طالب علم شرکت کرسکتا ہے۔

اکیسویں صدی میں روزگار کی کوئی کمی نہیں۔ لیکن ساتھ ہی روزگار مارکیٹ نے اپنے اندر نئے تقاضے پیدا کرلیے ہیں اور یہ تقاضے ہیں امتیازی صلاحیت اور امتیازی قابلیت — اس کے ساتھ ہی لچک دار رویہ (Flexible Approach) اور اپنی قابلیت پر بھرپور اعتماد۔ ان صلاحیتوں کے ساتھ طالب علم روزگار مارکیٹ میں قدم رکھتا ہے تو اکیسویں صدی ایسے طالب علم کے لیے روزگار کے بہترین مواقع رکھتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ انگریزی زبان پر بہترین عبور طالب علم کے لیے ہمیشہ ہی کامیابیوں اور کامرانیوں کے مواقع فراہم کرتا رہے گا۔

ان مسابقتی امتحانات کی تیاری کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم دسویں جماعت ہی سے ان خطوط پر سوچیں اور کام کریں۔ اس سلسلے میں ایک قومی انگریزی اخبار کا مطالعہ، ایک سیاسی ہفت روزہ میگزین اور ایک ماہنامہ کیریر میگزین کا مطالعہ ہر طالب علم کے لیے ناگزیر ہوگا۔ اس ضمن میں تین نام بنیادی طور پر نشاندہی کی خاطر لیے جاسکتے ہیں جن کا مطالعہ ہر طالب علم کے لیے دسویں جماعت ہی سے کسی بھی مسابقتی امتحان میں اچھی کامیابی کے لیے ناگزیر ہے۔

1. The Hindu - English Daily.
2. Outlook English Weekly.
3. Frontline - Fortnightly - Chennai.
4. Employment News English Weekly - New Delhi.
5. Rozgar Samachar Urdu/Hindi Weekly. New Delhi.
6. Career India Urdu Weekly, 161, Nehru Nagar, Kachiguda, Hyderabad-500027
7. Competition Success Review (CSR) Monthly.

ان مسابقتی امتحانات میں ایک بات جو کلیدی اہمیت کی حامل ہے وہ جنرل نالج ہے۔ اس کے لیے مذکورہ اخبارات و رسائل کا مطالعہ اور گہرا باقاعدہ مطالعہ طالب علم کے لیے مفید ہوگا۔

ہم یہاں طالب علم کی منصوبہ بندی اور پلاننگ کی خاطر سال 2005 میں منعقد ہونے والے ان مسابقتی امتحانات کی تفصیلات فراہم کررہے ہیں تاکہ طالب علم بہتر طور پر قبل از وقت ان امتحانات کی تیاری کرسکیں اور کامیاب ہوسکیں۔ یہ ایسے امتحانات ہیں جن میں سے کسی ایک میں کامیابی ان کے اپنے لیے اپنے خاندان کے لیے اور بالواسطہ ساری قوم کے لیے باعثِ فخر ہوگی۔

CLAENDAR for EXAMINATIONS - 2005

Programme of Examinations/RTs to be held during the year 2005

Sr. No.	Name of Examination	Date of Notification (Saturday)	Last Date for Receipt of Applications See Note 2 Below	Date/Day of Commencement of Emamination	Duration of Examination
1	Combined Medical Services Exam, 2005	21 Aug 2004	20 Sept 2004 (Monday)	16 Jan 2005 (Sunday)	1 Day
2	Recruitment Test			30 Jan 2005 (Sunday)	1 Day (Two Tests)
3	CDS Exam (I), 2005	11 Sept 2004	11 Oct 2004 (Monday)	13 Feb 2005 (Sunday)	1 Day
4	Recruitment Test			06 Mar 2005 (Sunday)	1 Day (Two Tests)
5	NDA & NA Exam (I), 2005	16 Oct 2004	16 Nov 2004 (Tuesday)	17 Apr 2005 (Sunday)	1 Day
6	Civil Services (Prel) Exam, 2005	04 Dec 2004	03 Jan 2005 (Monday)	15 May 2005 (Sunday)	1 Day
7	Engineering Services Exam 2005	08 Jan 2005	07 Feb 2005 (Monday)	11 Jun 2005 (Saturday)	3 Days
8	Recruitment Test			26 Jun 2005 (Sunday)	1 Day (Two Tests)
9	IFS Exam, 2005	05 Feb 2005	07 Mar 2005 (Monday)	09 July 2005 (Sunday)	10 Days
10	SCRA Exam, 2005	19 Feb 2005	21 Mar 2005 (Monday)	24 July 05 Sunday	1 Day
11	Recruitment Test			07 Aug (Sunday)	1 Day (Two Tests)
12	NDA & NA Exam (II), 2005	19 Mar 2005	18 Apr 2005 (Monday)	21 Aug 2005 (Sunday)	1 Day
13	CDS Exam (II), 2005	23 Apr 2005	24 May 2005 (Tuesday)	18 Sep 2005 (Sunday)	1 Day
14	Central Police Forces Exam 2005	07 May 2005	06 June 2005 (Monday)	16 Oct 2005 (Sunday)	1 Day
15	Civil Services (Main) Exam, 2005	--	--	21 Oct 2005 (Friday)	21 Days
16	IES/ISS Exam, 2005	11 Jun 2005	11July 2005 (Monday)	19 Nov 2005 (Saturday)	03 Days
17	Geologists Exam, 2005	18 Jun 2005	18 July 2005 (Monday)	26 Nov 2005 (Saturday)	03 Days
18	Recruitment Test			11 Dec 2005 (Sunday)	1 Day (Two Tests)
19	SO/Steno (Gd B/Gd-I) Ltd Deptt Competitive Exam, 2005	26 Jun 2005	22 Aug 2005 (Monday)	26 Dec 2005 (Monday)	4 Days

161, Career Manzil,
Nehru Nagar, Kachiguda
Hyderabad-500027

شفقت علی

بنیادی پیج بنانا

فرنٹ پیج کلپ آرٹ گیلری استعمال کرنا

فرنٹ پیج میں سیزہ آئیکانز، بٹنوں، لائنوں، بیک گراؤنڈ اور متحرک گرافکس پر مشتمل ایک بڑی لائبریری موجود ہے جسے کلپ آرٹ گیلری (Clip Art Gallery) کہا جاتا ہے۔ کلپ آرٹ گیلری سے پیج میں تصاویر ڈالنے کا عمل نہایت آسان ہے۔ اس کے لیے مندرجہ ذیل عمل کریں۔

1- پیج ویو میں رہتے ہوئے Insert کے مینو میں Picture کی کمانڈ پر ماؤس کا کرسر لائیں اور کھلنے والے سائیڈ مینو سے Clip Art کی کمانڈ چنیں یا اسٹینڈرڈ ٹول بار پر موجود Insert Picture ٹول پر کلک کریں۔ کلپ آرٹ گیلری کی ونڈو کھل جائے گی۔

2- کسی کیٹگری مثلاً Signs, Cartoons یا Web Buttons وغیرہ پر کلک کریں۔ اس کیٹگری سے متعلقہ تمام دستیاب تصاویر اس ونڈو کے بڑے حصے میں ظاہر ہو جائیں گی۔

3- مطلوبہ تصویر پر کلک کریں۔ ایک مینو ظاہر ہوگا جس میں مختلف آپشنز مثلاً Insert Add Clip To Favorites, Preview Clip, Clip اور Find Similar Clips موجود ہوں گے۔

4- کلپ کو انسرٹ کرنے کے لیے مینو میں موجود Insert Clip بٹن پر کلک کریں۔ ونڈو بند ہو جائے گی اور آپ کی منتخب شدہ تصویر ڈاکومنٹ میں آموجود ہوگی۔

ایک بار تصویر پیج میں ڈالنے کے بعد آپ اس پر کلک کر کے اس کے ساتھ مختلف کام کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ اس کی جگہ تبدیل کرنے کے لیے اسے کٹ اور پیسٹ کر سکتے ہیں، اس کی ایک سے زیادہ کاپیاں بنانے کے لیے کاپی اور پیسٹ کا عمل کر سکتے ہیں۔ کاپی اور پیسٹ کر کے ایک سے زیادہ کاپیاں بنانے والی تکنیک سے آپ پیج میں بار بار استعمال ہونے والی تصاویر مثلاً بٹن وغیرہ کو بار بار انسرٹ کرنے کا وقت بچا سکتے ہیں۔ آپ تصویر کی جگہ تبدیل کرنے کے لیے ڈریگ اور ڈراپ والی تکنیک بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ تصویر کا سائز تبدیل کرنے کے لیے اس پر کلک کریں اور اس کے کناروں پر نمودار ہونے والے چھوٹے چھوٹے سائز باکسز کو استعمال کریں۔

فرنٹ پیج ویب میں تصاویر امپورٹ کرنا

تصویر کا امپورٹ کرنا، اپنے کمپیوٹر یا لوکل نیٹ ورک یا انٹرنیٹ پر کسی ویب سائٹ میں محفوظ تصویر کو حاصل کرنے اور اپنے ویب پیج میں منتقل کرنے کے عمل کا نام ہے۔ جب آپ اپنے فرنٹ پیج ویب میں ایک تصویر امپورٹ کرتے ہیں تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ تصویر اپنے ویب پیج میں ڈالتے ہیں یعنی جس طرح آپ اپنے پیج میں تصویر انسرٹ کرتے ہیں تو وہ پیج میں منتخب شدہ جگہ میں پیسٹ ہو جاتی ہے۔ بلکہ ان تصاویر کی فائلیں آپ کی سائٹ میں کاپی ہو جاتی ہیں جن کو بعد میں آپ آسانی کے ساتھ اپنے ویب پیج میں ڈال سکتے ہیں۔

تصویروں کو امپورٹ کرنے کا عمل نہایت سادہ ہے۔ صرف مندرجہ ذیل عمل کریں۔

1- Views کے مینو سے Folders View کمانڈ چنیں یا Views کی ٹول بار پر موجود Folders کے آئیکان پر کلک کریں۔ ایسا کرنے سے آپ کے ویب کی فائلیں اور ڈائریکٹریاں ظاہر ہوں گی۔

2- اگر آپ Images کی ڈائرکٹری میں تصاویر امپورٹ کرنا چاہتے ہیں تو اس کی ڈائریکٹری پر ڈبل کلک کریں جس سے اس کے اجزا ظاہر ہو جائیں گے۔ ضروری نہیں ہے کہ آپ اسی ڈائریکٹری میں تصاویر امپورٹ کریں۔ آپ اپنی مرضی کی کوئی بھی ڈائرکٹری منتخب کر کے اس پر ڈبل کلک کریں۔

3- File کے مینو سے Import کمانڈ چنیں۔ Import کا ڈائیلاگ باکس کھل جائے گا۔

4- Images فولڈر میں ایک فائل ڈالنے کے لیے Add File بٹن پر کلک کریں۔ Add File to Import List کا ڈائیلاگ باکس کھل جائے گا۔ یہ ڈائیلاگ باکس ونڈوز کے کسی بھی پروگرام کے تحت کھلنے والے Open کے ڈائیلاگ باکس کی طرح ہے۔ اس ڈائیلاگ باکس کو استعمال کرتے ہوئے مطلوبہ فائل سامنے لائیں اور اسے منتخب کر لیں اور Open بٹن پر کلک کر دیں۔ آپ Import کے ڈائیلاگ باکس میں واپس آجائیں گے جس میں آپ کی منتخب شدہ فائل لسٹ میں موجود ہوگی۔

یا

Images کے فولڈر میں کسی فولڈر کے تمام اجزا ڈالنے کے لیے Add Folder بٹن پر کلک کریں۔ Browse for folder کا ڈائیلاگ باکس کھل جائے گا۔ مطلوبہ فولڈر تلاش کر کے اسے منتخب کریں اور OK پر کلک کر دیں۔ آپ Import کے ڈائیلاگ باکس میں واپس آجائیں گے جس میں منتخب شدہ فولڈر کے اندر موجود تمام فائلوں کے نام لسٹ میں درج ہوں گے۔

یا

کسی پہلے سے موجود ویب سائٹ سے فائلیں امپورٹ کرنے کے لیے

From Web بٹن پر کلک کریں۔ Import Web Wizard ظاہر ہوگا۔ اس وزرڈ کے تمام ضروری مراحل کی پیروی کرتے ہوئے مطلوبہ فائلیں حاصل کریں۔

5- مطلوبہ مقدار کے مطابق تصاویر لسٹ میں ڈالنے کے بعد OK بٹن پر کلک کردیں۔ فائلیں امپورٹ ہونا شروع ہوجائیں گی اور جب تمام فائلیں امپورٹ ہوچکیں گی تو Import کا ڈائیلاگ باکس بند ہوجائے گا۔

ان تصاویر کو ویب پیجز میں رکھنا نہایت آسان ہے۔

ویب پیجز پر تصاویر رکھنا

ان تصاویر کو پیج ویو کے ذریعے ویب پیج پر رکھا جاسکتا ہے۔ اس کے لیے مندرجہ ذیل عمل کریں۔

1- پیج ویو میں ویب پیج کھولے ہوئے Insert کے مینو میں موجود Picture کمانڈ کے سائیڈ مینو سے From File کی کمانڈ چنیں۔ Picture کا ڈائیلاگ باکس ظاہر ہوگا۔

2- یہ ڈائیلاگ باکس آپ کے موجودہ فرنٹ پیج ویب کے فولڈرز دکھاتا ہے۔ اگر آپ کی مطلوبہ تصویر آپ کے موجودہ فرنٹ پیج ویب میں ہی موجود ہے تو اس کے فولڈر پر ڈبل کلک کریں (جو کہ عام طور پر Images کے نام کا ہوتا ہے) جس سے اس فولڈر کے تمام اجزا ڈائیلاگ باکس میں ظاہر ہوجائیں گے۔ ان میں سے مطلوبہ فائل پر کلک کریں۔ تصویر کی جگہ ڈائیلاگ باکس میں موجود URL کے ڈراپ ڈاؤن لسٹ باکس میں ظاہر ہوجائے گی۔

3- مطلوبہ فائل منتخب کرنے کے بعد OK بٹن پر کلک کردیں۔

آپ کی منتخب کردہ تصویر پیج ویو ونڈو میں ظاہر ہوجائے گی۔ اب آپ اس تصویر کی جگہ تبدیل کرنے کے لیے کٹ اور پیسٹ کا طریقہ کار استعمال کریں۔

تصویر کی خصوصیات متعین کرنا

ایک دفعہ تصویر اپنے پیج پر رکھنے کے بعد آپ اسے مختلف حوالوں سے تبدیل کرسکتے ہیں مثلاً آپ تصویر کا سائز یا اس کی الائنمنٹ تبدیل کرسکتے ہیں یا تصویر کے گرد بارڈر لگا سکتے ہیں۔ یہاں ہم پیج کے اندر رہتے ہوئے تصویر کی مختلف خصوصیات متعین کرنے اور تبدیل کرنے پر بات کریں گے۔ اس کے لیے مندرجہ ذیل عمل کریں۔

1- جس تصویر کی خصوصیات آپ تبدیل کرنا چاہتے ہیں اس پر رائٹ کلک کریں اور کھلنے والے مینو سے Picture Properties کمانڈ چنیں یا تصویر پر کلک کرکے Alt+Enter دبائیں۔ اس کا ڈائیلاگ باکس کھل جائے گا۔ جس میں تصویر کی جگہ اور قسم پہلے سے مخصوص ہوگی۔

2- اس کے بعد آپ یہ تعین کرسکتے ہیں کہ اصل تصویر کے لوڈ ہونے سے پہلے اس کا کم ریزولوشن کا بلیک اینڈ وائٹ ورژن لوڈ ہوگا۔ بہت سے ویب براؤزرز اس کی پیروی کریں گے اور وہ بھی جو عام طور پر اصل تصویر لوڈ نہیں کرسکتے۔ اس فیچر کو استعمال کرنے کے لیے Low-Res کے ٹیکسٹ باکس میں تصویر کا URL لکھ دیں۔ یہ فیچر ان دنوں استعمال نہیں ہورہا اس لیے بہتر یہ ہے کہ اس ٹیکسٹ باکس کو خالی ہی چھوڑ دیں۔

3- آپ تمام ظاہر ہونے والی تصاویر کے لیے متبادل تحریر کا تعین ضرور کرتے ہیں۔ یہ تحریر تصویر کی جگہ دکھائی دیتی ہے۔ یہ تحریر ان لوگوں کو مدد فراہم کرتی ہے جو تصاویر کو خود بخود لوڈ کرنے کا عمل بند کردیتے ہیں یا جو صرف تحریر دکھانے والے براؤزر استعمال کرتے ہیں۔ نئے براؤزرز استعمال کرنے والے لوگ اس متبادل تحریر کو تصویر کے لیے ٹول ٹپ کے طور پر استعمال کرسکتے ہیں۔ اس تحریر کے لیے تصویر کا نام یا اس کی وضاحت Text کے ٹیکسٹ باکس میں لکھیں۔

4- آپ Style بٹن پر کلک کرکے کسی بھی اسٹائل شیٹ کی معلومات کو تبدیل کرسکتے ہیں۔ ایک نیا ڈائیلاگ باکس کھل جاتا ہے جس میں آپ اسٹائل شیٹس میں تبدیلی کرسکتے ہیں۔

5- Picture Properties ڈائیلاگ باکس میں Appearance ٹیب پر کلک کریں۔

6- اس ٹیب کے Layout کے حصے میں آپ تصویر کی الائنمنٹ کا تعین کرسکتے ہیں۔ آپ تصویر کو براؤزر کی ڈیفالٹ سیٹنگ کے مطابق الائن کرسکتے ہیں۔ اس کے لیے Default چنیں۔ اس کے علاوہ کوئی اور الائنمنٹ چننے کے لیے Alignment ڈراپ ڈاؤن میں سے کوئی ایک آپشن چنیں۔ یہ آپشن مندرجہ ذیل ہیں۔

Left: یہ آپشن چننے سے تصویر براؤزر ونڈو کے بائیں طرف الائن ہوجاتی ہے اور تحریر اور دوسرے اجزا تصویر کے دائیں طرف پھیل جاتے ہیں۔

Right: یہ آپشن چننے سے تصویر براؤزر ونڈو کے دائیں طرف الائن ہوجاتی ہے اور تحریر اور باقی اجزا تصویر کے بائیں طرف پھیل جاتے ہیں۔

Top: یہ آپشن چننے سے تصویر ایک لائن میں موجود سب سے اونچے اوبجیکٹ کی اونچائی کے مطابق الائن ہوجاتی ہے۔

Texttop: یہ آپشن چننے سے تصویر ایک لائن میں موجود سب سے اونچے حرف کی اونچائی کے مطابق الائن ہوجاتی ہے۔

Middle: یہ آپشن چننے سے تصویر، تحریر کے درمیانی حصے کے مطابق درمیان میں الائن ہوجاتی ہے۔

Absmiddle: یہ آپشن چننے سے تصویر موجودہ لائن میں موجود سب سے بڑے آئٹم کے درمیان الائن ہوجاتی ہے۔

Baseline: یہ آپشن چننے سے تصویر کا نچلا حصہ ساتھ موجود تحریر کے نچلے حصے کے مطابق الائن ہوجاتا ہے۔

Bottom: یہ آپشن چننے سے تصویر کا نچلا حصہ ساتھ موجود تحریر کے نچلے حصے کے مطابق الائن ہو جاتا ہے۔

Absbottom: یہ آپشن چننے سے تصویر کا نچلا حصہ موجودہ لائن میں موجود سب سے بڑے آئٹم کے نچلے حصے کے مطابق الائن ہو جاتا ہے۔

Center: یہ آپشن تصویر کو افقی طور پر براؤزر ونڈو کے درمیان میں الائن کر دیتا ہے۔

7- آپ تصویر کے چاروں طرف خالی جگہ کا مارجن بھی متعین کر سکتے ہیں۔ Horizontal اور Vertical نمبر باکسز میں مطلوبہ نمبر لکھیں۔ آپ کو چاہیے کہ ہر تصویر کے گرد مناسب مقدار میں خالی جگہ ضرور مخصوص کریں۔ یہ خالی جگہ تصویر اور تحریر کے درمیان فاصلہ مقرر کرتی ہے۔ اگر آپ یہ فاصلہ مقرر نہیں کرتے تو تحریر بالکل تصویر کے ساتھ مل جائے گی جس سے اسے پڑھنے میں بھی دشواری ہوگی اور پیج کی خوبصورتی بھی متاثر ہوگی۔

8- تصویر کا سائز مقرر کرنے سے براؤزر اس کو زیادہ آسانی سے لوڈ کرتا ہے کیوں کہ یہ تصویر کو لانے کے عمل کے دوران مخصوص کردہ سائز کے مطابق ونڈو میں عارضی جگہ مقرر کر دیتا ہے۔ جب آپ پہلی دفعہ تصویر انسرٹ کرتے ہیں تو فرنٹ پیج خود بخود اس کا سائز متعین کر دیتا ہے لیکن آپ اس سائز کو تبدیل کر سکتے ہیں۔

9- آپ تصویر کے گرد بارڈر لگا سکتے ہیں۔ اس کے لیے Border Thickness کے ٹیکسٹ باکس میں بارڈر کی موٹائی کے لیے نمبر (پکسلز میں) لکھیں۔ اگر آپ ٹیکسٹ باکس کو خالی رہنے دیتے ہیں یا 0 لکھتے ہیں تو بارڈر ظاہر نہیں ہوگا۔

10- جب آپ تمام خصوصیات متعین کر لیں تو انہیں تصویر پر لاگو کرنے کے لیے OK بٹن پر کلک کر دیں۔

ویب سے تصویریں استعمال کرنا

اگر کوئی تصویر انٹرنیٹ پر کسی FTP یا ویب سرور میں موجود ہے تو آپ اپنے ویب براؤزر کی مدد سے اسے منتخب کر کے Image ڈائیلاگ باکس کو استعمال کرتے ہوئے اسے اپنے پیج میں ڈال سکتے ہیں۔ یا اگر آپ مائیکروسافٹ انٹرنیٹ ایکسپلورر نامی براؤزر استعمال کر رہے ہیں تو مطلوبہ تصویر پر رائٹ کلک کریں اور نمودار ہونے والے مینو سے Copy Picture کی کمانڈ چنیں۔ اس کے بعد فرنٹ پیج کے پیج ویو میں آ کر Ctrl+V دبا کر تصویر کو پیج پر پیسٹ کر لیں۔ اس عمل سے تصویر کی فائل آپ کی سائٹ میں کاپی نہیں ہوتی بلکہ اس عمل سے صرف تصویر پیج پر پیسٹ ہوتی ہے اور اس کا URL متعلقہ سرور کا پتہ دیتا ہے۔

اگر آپ نیٹ اسکیپ نیوی گیٹر نامی براؤزر استعمال کر رہے ہیں تو مندرجہ ذیل عمل کریں۔

1- پیج ویو میں رہتے ہوئے پیج پر وہاں کلک کریں جہاں آپ تصویر رکھنا چاہتے ہیں۔

2- Insert کے مینو میں موجود Picture کے سائیڈ مینو سے From File کی کمانڈ چنیں۔ Picture کا ڈائیلاگ باکس کھل جائے گا۔

3- اس میں نیلے رنگ کے گلوب والے آئیکان پر کلک کریں۔ کچھ لمحوں بعد آپ کا ڈیفالٹ براؤزر کھل جائے گا جس میں مندرجہ ذیل پیغام ظاہر ہوگا۔
"Browse to the page or file you want to use, then return to Microsoft Frontpage to continue..."

4- انٹرنیٹ پر اپنی مطلوبہ تصویر اپنی پسند کے طریقے سے تلاش کریں۔

5- جب آپ کی مطلوبہ تصویر رکھنے والا پیج کھل جائے تو اس کی اپنی ونڈو میں تصویر کو دیکھیں۔

اس کے لیے تصویر پر رائٹ کلک کریں اور ظاہر ہونے والے مینو سے View Image کی کمانڈ چنیں۔

6- جب تصویر رکھنے والا پیج (یا تصویر خود ہی) براؤزر ونڈو میں ظاہر ہو جائے تو ونڈوز ٹاسک بار کو استعمال کرتے ہوئے پیج ویو میں واپس آئیں۔

7- Image ڈائیلاگ باکس میں OK بٹن پر کلک کریں۔

پیج ویو میں منتخب شدہ جگہ پر آپ کی مطلوبہ تصویر آ موجود ہوگی۔ اب آپ اس تصویر کی مختلف خصوصیات کو پیچھے بیان کردہ طریقے کے مطابق تبدیل یا متعین کر سکتے ہیں۔

پیج میں لائنیں استعمال کرنا

افقی لائنیں پیج کے مختلف حصوں کو علیحدہ کرنے کے لیے لگائی جاتی ہیں۔ آپ ڈاکومنٹ کی سرخی کے نیچے، یادداشت یا مضمون کے حصوں کے درمیان یا کسی بھی جگہ پر افقی لائن لگا سکتے ہیں۔ یہ لائنیں HTML کے ٹیگ <HR> کو استعمال کرتے ہوئے لگائی جاتی ہیں۔

ان لائنوں کے ساتھ سفید خالی جگہ پر مشتمل ایک لائن پہلے اور ایک بعد میں لگتی ہے اور ان کی خصوصیات میں اونچائی، چوڑائی اور سہ سمتی سائے کی سیٹنگ شامل ہوتی ہے۔ جب آپ ایک افقی لائن ڈالتے ہیں تو ایک کھدی ہوئی (Embossed) لائن لگ جاتی ہے جو پیج کے درمیان میں الائن ہوتی ہے اور ونڈو کی سو فیصد چوڑائی کو گھیر لیتی ہے۔ بعد میں آپ اس لائن کی شکل و صورت اور دیگر خصوصیات تبدیل کر سکتے ہیں۔

ایک لائن ڈالنا

اپنے پیج پر لائن لگانے کے لیے مندرجہ ذیل عمل کریں۔

1- پیج ویو ونڈو میں ایک پیج کھولیں۔ وہاں پر کلک کریں جہاں پر آپ لائن لگانا چاہتے ہیں۔

2- Insert کے مینو سے Hrizontal Line کی کمانڈ چنیں۔ ایک سہ سمتی (3D) لائن پیج پر ظاہر ہو جائے گی۔

□□□

محمد معین الدین

کوئز

تنقید و تحقیق

(1) "تنقید ادب کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا زندگی کے لیے سانس" کس کا قول ہے؟

(الف) ٹی ایس ایلیٹ (ب) میتھیو آرنلڈ

(ج) ٹین (د) بیکن

(2) "تحقیق کے لیے معلومات کی ضرورت ہے جبکہ تنقید کے لیے معلومات درکار ہے" کس نے کہا؟

(الف) حالی (ب) شبلی

(ج) مولوی عبدالحق (د) احسن فاروقی

(3) سید امداد امام اثر کی کتاب "کاشف الحقائق" کا موضوع کیا ہے؟

(الف) تاریخ (ب) تذکرہ

(ج) تنقید (د) شاعری

(4) غالب کے کلام کی تدوین کے لیے کون معروف ہے؟

(الف) امتیاز علی خاں عرشی (ب) قاضی عبدالودود

(ج) پروفیسر نذیر احمد (د) محمود شیرانی

(5) "غیر معتبر حوالے" کس کا مضمون ہے؟

(الف) قاضی عبدالودود (ب) رشید حسن خاں

(ج) محی الدین قادری زور (د) محمود خاں شیرانی

(6) "روایت اور بغاوت" کس کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے؟

(الف) آل احمد سرور (ب) احتشام حسین

(ج) خورشید الاسلام (د) خواجہ احمد فاروقی

(7) جدیدیت کا علمبردار نقاد کس کو کہا جاتا ہے؟

(الف) محبوب الرحمان فاروقی (ب) محمد حسن

(ج) قمر رئیس (د) شمس الرحمان فاروقی

(8) تنقیدی مضامین کا مجموعہ "اندازے" کا مصنف کون ہے؟

(الف) رشید احمد صدیقی (ب) یوسف حسین خاں

(ج) فراق گورکھپوری (د) آل احمد سرور

(9) نفسیاتی تنقید کو اردو میں متعارف کرانے کا سہرا کس کے سر ہے؟

(الف) میراجی (ب) محمد حسن

(ج) اختر رائے پوری (د) سجاد ظہیر

(10) مارکسی تنقید کا آغاز کس دور میں ہوا؟

(الف) علی گڑھ تحریک (ب) جدیدیت

(ج) ترقی پسند تحریک (د) رومانی تحریک

(11) "افکار کے دیئے" کس موضوع سے متعلق کتاب ہے؟

(الف) افسانہ (ب) شاعری

(ج) ناول (د) تنقید

(12) مندرجہ ذیل میں کون سی کلیم الدین احمد کی کتاب نہیں ہے؟

(الف) اردو شاعری پر ایک نظر (ب) فن داستان گوئی

(ج) اردو تنقید پر ایک نظر (د) اردو تنقید کا ارتقا

(13) "تنقید شعر العجم" کا مصنف کون ہے؟

(الف) قاضی عبدالودود (ب) محی الدین قادری زور

(ج) رشید حسن خاں (د) محمود خاں شیرانی

(14) ذیل میں درج یہ شعر تنقیدی عنصر رکھتا ہے اس کے خالق کا نام بتائیں؟

جسے ربط بولے تو بیتاں بکیں
بجا ہے جو یک بیت بولے سلیس

(الف) ولی (ب) سراج

(ج) وجہی (د) غواصی

(15) میر نے اپنے تذکرے "نکات الشعرا" میں کس شاعر کو "مطلق جاہل" کہا ہے؟

(الف) یقین (ب) خاکسار

(ج) حاتم (د) یک رو

(16) شبلی کا شمار کس ذیل میں ہوتا ہے؟

(الف) تاثراتی تنقید (ب) جمالیاتی تنقید

(ج) مارکسی تنقید (د) نفسیاتی تنقید

(17) مندرجۂ ذیل میں سے کس کتاب کو سر سید اپنے لیے "توشۂ آخرت" سمجھتے تھے؟

(الف) مثنوی حب وطن (ب) مناظرہ رحم و انصاف

(ج) مسدس مدو جزر اسلام (د) مثنوی خواب امن

(18) شعر شور انگیز میں کس شاعر کے کلام کو موضوع بحث بنایا گیا ہے؟

(الف) غالب (ب) سودا

(ج) میر تقی میر (د) خواجہ میر درد

(19) 'روح تنقید'، 'مقالات اردو'، 'اسالیب بیان' کس کی تصانیف ہیں؟

(الف) محی الدین قادری زور (ب) نصیر الدین ہاشمی

(ج) رشید حسن خاں (د) محمد حسن عسکری

(20) ''گل رعنا'' کا موضوع کیا ہے؟

(الف) تذکرہ (ب) تاریخ

(ج) شاعری (د) تنقید

(21) فیض کی کتاب ''میزان'' کا موضوع ہے؟

(الف) شاعری (ب) سوانح

(ج) سفرنامہ (د) تنقید

(22) احتشام حسین کا تعلق بنیادی طور پر کس دبستان تنقید سے ہے؟

(الف) جمالیاتی تنقید (ب) مارکسی تنقید

(ج) ہیئتی تنقید (د) نفسیاتی تنقید

(23) ''جدیدیت ترقی پسندی کی توسیع ہے''، کس کا قول ہے؟

(الف) قمر رئیس (ب) لطف الرحمٰن

(ج) محمد حسن (د) شمس الرحمان فاروقی

(24) تحقیق کا مقصد ہے؟

(الف) نئی چیز پیدا کرنا (ب) کسی چیز پر تنقید کرنا

(ج) سچائی کی تلاش کرنا (د) مختلف ادوار کی تاریخی ترتیب

(25) ''ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات'' کس کی کتاب ہے؟

(الف) ابوالکلام قاسمی (ب) وزیر آغا

(ج) گوپی چند نارنگ (د) شمس الرحمان فاروقی

(26) مندرجہ ذیل میں سے کس نقاد نے اپنی تنقید کو ''تخلیقی تکرر'' کہا ہے؟

(الف) آل احمد سرور (ب) قمر رئیس

(ج) وزیر آغا (د) سلیم احمد

(27) مندرجہ ذیل میں سے ''وارث علوی'' کی تنقیدی کتاب کا نام؟

(الف) نیا افسانہ (ب) فکشن کی تنقید کا المیہ

(ج) اردو افسانہ روایت اور مسائل (د) افسانے کی حمایت میں

(28) ''شمس الرحمان فاروقی ایک ایسا نقاد نظر آتا ہے جس نے تنقید کی ایک نئی بوطیقا ترتیب دینے کی کوشش کی ہے'' کس کا قول ہے؟

(الف) فضیل جعفری (ب) محمد حسن عسکری

(ج) قمر رئیس (د) وہاب اشرفی

(29) اردو میں تقابلی تنقید کی بنیاد کس نے ڈالی؟

(الف) کلیم الدین احمد (ب) احتشام حسین

(ج) شبلی (د) حالی

(30) ''اردو تحریک'' کا مصنف کون ہے؟

(الف) مجنوں گورکھپوری (ب) کلیم الدین احمد

(ج) قاضی عبدالودود (د) آل احمد سرور

(31) ''دیوان غالب'' کی تدوین میں سب سے اہم نام؟

(الف) عبدالرحمان بجنوری (ب) یوسف حسین خاں

(ج) امتیاز علی عرشی (د) رشید حسن خاں

(32) کس نقاد کے تنقیدی مضامین کو ''تنقیدی انشائیے'' سے تعبیر کیا گیا ہے؟

(الف) محمد حسن عسکری (ب) خورشید الاسلام

(ج) وزیر آغا (د) آل احمد سرور

(33) مولوی عبدالحق کی شہرت کا سبب کیا ہے؟

(الف) تنقید (ب) انشائیے

(ج) تاریخ (د) تحقیق

(34) ''ارسطو سے ایلیٹ تک'' کس کی تصنیف ہے؟

(الف) عزیز احمد (ب) جمیل جالبی

(ج) مولوی عبدالحق (د) وزیر آغا

(35) ''سائنٹفک تنقید'' کا بانی کس کو کہا جاتا ہے؟

(الف) کارل مارکس (ب) تین

(ج) ایڈمر (د) فرائڈ

(36) ''آب حیات'' کتنے ادوار پر منقسم ہے؟

(الف) تین (ب) چار

(ج) پانچ (د) چھ

(37) ممتاز نقاد سلیم احمد اپنا روحانی و معنوی مرشد کسے تسلیم کرتے ہیں؟

(الف) شبلی (ب) محمد حسین آزاد

(ج) محمد حسن (د) محمد حسن عسکری

(38) مندرجہ ذیل میں سے مجنوں گورکھپوری کی تصنیف کون سی ہے؟

(الف) ادب اور سماج (ب) ادب اور زندگی

(ج) ادبی تنقید (د) ادب اور انقلاب

(39) کس نقاد کو ازبکستان کا ''بابر ایوارڈ'' حاصل ہوا؟

(الف) محمد حسن (ب) شمس الرحمان فاروقی

(ج) قمر رئیس (د) سید محمد عقیل رضوی

(40) ''ذکر میر''، ''روح انیس''، ''ہماری شاعری'' کے مصنف کا نام؟

(الف) مسعود حسین خاں (ب) مسعود حسن رضوی ادیب

(ج) سید محمد عقیل رضوی (د) خلیق انجم

(41) کس مغربی نقاد نے ادب کو "تنقید حیات" کہا ہے؟

(الف) ہوگرٹ (ب) میتھیو آرنلڈ

(ج) ٹی ایس ایلیٹ (د) لون جائنس

(42) "محمد حسین آزاد نے اردو میں تنقید کی بنیاد رکھی مگر کچی پھر بھی یہ کیا کم ہے کہ انھوں نے بنیاد رکھی تو" کس کا قول ہے؟

(الف) کلیم الدین احمد (ب) احتشام حسین

(ج) ڈاکٹر احسن فاروقی (د) مجنوں گورکھپوری

(43) "تلاش و توازن"، "تلاش و تعبیر" مجموعہ ہیں؟

(الف) تنقیدی مضامین کا (ب) افسانوی کہانیوں کا

(ج) غزلوں کا (د) خاکوں کا

(44) وقار عظیم کی شہرت کا سبب؟

(الف) افسانہ نگاری (ب) افسانوی تنقید

(ج) شاعری (د) تحقیق

(45) کس مغربی نقاد نے تنقید کو "ادب کے جسم کا کوڑھ" بتایا؟

(الف) چیخوف (ب) فلابیر

(ج) ٹینی سن (د) ڈرائیڈن

(46) کون اردو شاعر زندگی بھر تنقید کا مخالف رہا؟

(الف) مجاز (ب) جوش

(ج) ن م راشد (د) مخدوم

(47) نیاز فتح پوری کی کتاب "مالہ و ماعلیہ" کا موضوع کیا ہے؟

(الف) تنقید (ب) تاریخ

(ج) تصوف (د) زبان و قواعد

(48) "نقاد کا کام صرف بت گری نہیں بت شکنی بھی ہے اور کلیم الدین احمد نے بہت سے بت توڑے" کس کا قول ہے؟

(الف) احتشام حسین (ب) محمد حسن

(ج) آل احمد سرور (د) وزیر آغا

(49) "تلامذۂ غالب" کا مصنف کون ہے؟

(الف) امتیاز علی خاں عرشی (ب) محمود خاں شیرانی

(ج) مالک رام (د) مولوی عبدالحق

(50) پٹنہ سے ایک تحقیقی رسالہ "معاصر" کس محقق نے نکالا؟

(الف) مالک رام (ب) مختار الدین

(ج) مسیح الزماں (د) قاضی عبدالودود

(51) "داستان تاریخ اردو" کو نیاز فتح پوری نے "اردو نثر کا انسائیکلوپیڈیا" کہا ہے، یہ کس کی تصنیف ہے؟

(الف) مولوی عبدالحق (ب) سید عبداللہ

(ج) رام بابو سکسینہ (د) حامد حسن قادری

(52) قدرت اللہ قاسم کے تذکرے "مجموعہ نغز" کو کس نے مرتب کیا؟

(الف) امتیاز علی خاں عرشی (ب) محمود خاں شیرانی

(ج) محی الدین قادری زور (د) مالک رام

(53) افسانوی تنقید اور ماہر پریم چند کی حیثیت سے کون معروف ہے؟

(الف) گوپی چند نارنگ (ب) گیان چند جین

(ج) قمر رئیس (د) ممتاز حسین

(54) مولوی عبدالحق نے کس کتاب کے بارے میں کہا ہے کہ "بعض اوقات پڑھتے پڑھتے جی متلانے لگتا ہے"؟

(الف) نوطرز مرصع (ب) فسانۂ عجائب

(ج) گنج خوبی (د) باغ و بہار

جوابات اسی شمارے میں تلاش کریں:

52, Tapti Hostel, JNU
New Delhi-110067

□□□

قومی اردو کونسل نے نہ صرف حوالہ جاتی بلکہ اعلا درجات کی ضرورتوں کے مطابق درسی کتابیں شائع کی ہیں۔

طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت
تاجران کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جاتا ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
ویسٹ بلاک۔ 1، آر۔ کے۔ پورم، ونگ-6، نئی دہلی-110066

جاوید اقبال

کمپیوٹر سینٹر کے فارغ طلبہ کے انٹرویو-19

بڑھتے قدم

محمد فیروز عالم نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں کشن پور میں حاصل کی اور اس کے بعد مارواڑی کالج، رانچی سے گریجویشن کیا۔ گریجویشن کے دوران ہی انہوں نے کونسل کے کمپیوٹر سینٹر مرکز ادب و سائنس، رانچی سے یک سالہ ڈپلوما اِن کمپیوٹر اپلی کیشن اینڈ ملٹی لنگول ڈی۔ٹی۔پی۔ کورس بھی مکمل کیا اور آج اسی کمپیوٹر کورس کی بدولت ادارے میں سپروائزر کا کام انجام دے رہے ہیں۔ ان کا مختصر انٹرویو قارئینِ "اردو دنیا" کے لیے پیش ہے۔

سوال: کمپیوٹر سے آپ کو کیسے دلچسپی ہوئی؟

جواب: جب میں نے کمپیوٹر کے بارے میں سنا تو دل میں اسے دیکھنے اور چلانے کی آرزو پیدا ہوئی۔ یہ بالکل نئی اور انوکھی چیز لگی، اسی وقت دل میں کمپیوٹر کی تعلیم حاصل کرنے کی تمنا پیدا ہوگئی۔ یہی شوق تھا، جو کمپیوٹر سے دلچسپی کا باعث بنا اور یہی دلچسپی کمپیوٹر کی تعلیم کے حصول کا ذریعہ بھی بنی۔

سوال: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹر دوسرے سینٹروں سے کس اعتبار سے مختلف ہیں؟

جواب: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹروں میں اردو کا سافٹ ویئر پڑھایا جاتا ہے، نصاب کی کتابیں مفت مہیا کرائی جاتی ہیں، دوسرے کمپیوٹر سینٹروں کے مقابلے فیس بھی کم ہے، حکومت کی جانب سے سرٹیفکیٹ بھی ملتا ہے جس سے نوکری حاصل کرنے میں مدد ملتی ہے۔

سوال: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹروں میں جو تربیت دی جا رہی ہے۔ اس سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

جواب: میں قومی کونسل کے کمپیوٹر سینٹروں میں دی جانے والی تربیت سے پوری طرح مطمئن ہوں، طرزِ تعلیم و تربیت بہت عمدہ ہے اور اساتذہ بھی باصلاحیت ہوتے ہیں جو تربیت کے دوران پوری طرح معاونت کرتے ہیں۔

سوال: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹر اردو داں طبقے کو روزگار فراہم کرانے میں کس حد تک معاون ہیں؟

جواب: آج سے تقریباً 10-8 سال قبل مدارس سے فارغ طلبہ کمپیوٹر کورس کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے لیکن جب سے قومی اردو کونسل نے اردو کے ذریعے کمپیوٹر کورس کا اعلان کیا تب سے اب تک ہزاروں اردو داں اس سے جڑ کر ایک خوشگوار زندگی گزار رہے ہیں، جن میں ایک میں بھی شامل ہوں۔

سوال: انفارمیشن ٹیکنالوجی کی دنیا کا حصہ بن کر آپ کو کیسا لگ رہا ہے؟

جواب: اچھا لگ رہا ہے۔ میں جس احساسِ کمتری کا شکار تھا وہ دور ہو چکی ہے اور اپنے آپ کو زمانے کے ساتھ محسوس کر رہا ہوں۔

سوال: اس میدان میں آنے کے بعد کیا آپ میں کوئی بدلاؤ آیا ہے؟ کیا آپ کی خود اعتمادی اور خود انحصاری میں اضافہ ہوا ہے؟

جواب: کافی بدلاؤ آیا ہے، آئی۔ٹی۔ کے میدان میں آگے بڑھنے کی راہ ہموار پا کر مسرت اور خود اعتمادی کا احساس ہو رہا ہے۔

سوال: آپ لازمی طور پر ملٹی لنگول ہیں۔ یہ آپ کے لیے ایک بے حد مثبت چیز ہے۔ آپ اپنی اس خصوصیت کی بنا پر مارکیٹ میں اپنے آپ کو کس مقام پر پاتے ہیں؟

جواب: ملٹی لنگول ہونے کی وجہ سے ہم کئی زبانوں میں کام کر سکتے ہیں اور چونکہ اس وقت کمپیوٹر سے وابستہ لوگ اردو سے زیادہ واقف نہیں ہیں، اس وجہ سے جو لوگ اردو کے ساتھ ساتھ ہندی اور انگریزی بھی جانتے ہیں، انھیں فطری طور پر اس کا فائدہ حاصل ہوگا۔

سوال: آپ نے کمپیوٹر سینٹر میں جو فیس ادا کی ہے، وہ آپ کے لیے بوجھ تو نہیں تھی؟

جواب: جی نہیں، فیس مناسب ہے کیوں کہ دوسری جگہوں پر بھی فیس کم نہیں ہے، اس لیے کم از کم میرے لیے تو اس کی ادائیگی بوجھ نہ تھی۔

411, Mansarover Hostel,
University of Delhi, Delhi-7

□□□

اردو خبر نامہ

مولانا عبدالماجد دریابادی کی حیات و خدمات پر قومی سمینار

● نئی دہلی، 15 رجنوری۔ شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مشترکہ تعاون سے مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی حیات و خدمات پر راجندر بھون میں ایک قومی سمینار کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت ہریانہ کے گورنر ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی نے کی۔ مولانا سید رابع حسنی ندوی نے سمینار کا باضابطہ افتتاح کیا۔ اس اجلاس سے مولانا محمد ولی رحمانی، ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ، مولانا انظر شاہ کشمیری، ڈاکٹر ہاشم قدوائی، ڈاکٹر سلیم قدوائی، محسنہ قدوائی اور بیگم حامدہ حبیب اللہ سمیت متعدد ممتاز شخصیات نے خطاب کیا۔

مولانا رابع حسنی ندوی نے اپنے خطاب میں کہا کہ ہمارا ملک مختلف مذاہب اور ثقافتوں کا گہوارہ ہے۔ اس کا تحفظ اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ انفرادی خصوصیات کے ساتھ اجتماعیت کا بھی تحفظ کیا جائے۔ اسی کا نام سیکولرزم ہے۔ مولانا حسنی نے کہا کہ مولانا عبدالماجد دریابادی نے ملک اور ملت دونوں کی بے مثال خدمات انجام دی ہیں۔ ان کے افکار و نظریات اور استدلال سے ہمیں آج بھی استفادہ کرنا چاہیے۔

ڈاکٹر اخلاق الرحمان قدوائی نے شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کی علمی خدمات کی تعریف کی اور کہا کہ مولانا ماجد کے فکر و خیال کی معنویت آج کے دور میں بھی بڑی اہم ہے۔ ڈاکٹر ہاشم قدوائی، محترمہ محسنہ قدوائی اور محترمہ حامدہ حبیب اللہ نے مولانا عبدالماجد دریابادی سے اپنے قریبی رشتے اور تعلق کے حوالے سے واقعات سنائے۔

قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے اس موقعے پر کہا کہ مغلوں کے زوال کے بعد جب ملک میں ہر جگہ طوائف الملوکی اور افراتفری کا دور دورہ تھا، اس زمانے میں شاہ ولی اللہ نے ہندستان کی مٹی سے جڑے لوگوں مراٹھے، سکھ اور روہیلوں کو ساتھ لے کر پرانی آب و تاب واپس لانے کی ضرورت محسوس کی اور اس کا ذکر اپنے سیاسی خطوط میں کیا۔ شاہ ولی اللہ کے یہ الفاظ سیکولرزم کے حرف اوّل ہیں۔ آج بھی اس سوچ کو رہنما بنانے کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے سمینار کے انعقاد میں گرانقدر تعاون کے ساتھ اپنی طرف سے ان تمام منصوبوں میں تعاون کی یقین دہانی کرائی جو شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ مولانا دریابادی کے تعلق سے ہاتھ میں لے گا۔ اختتامی کلمات ڈاکٹر محمد سلیم قدوائی نے پیش کیے۔

دوسرے سیشن کی صدارت مولانا محمد ولی رحمانی نے اور نظامت منصور آغا نے کی اور ڈاکٹر شافع قدوائی، پروفیسر یعقوب الرحمٰن، ڈاکٹر ریاض الرحمٰن خاں شیروانی، ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی، مفتی فضیل الرحمٰن بلال عثمانی، پروفیسر فشاء الرحمٰن خشا، مولانا حمید الزماں، بدرالدین الحافظ، پروفیسر ظہیر احمد جعفری، ڈاکٹر انور پاشا، ڈاکٹر شکیل الرحمٰن راز (دوحہ قطر) پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے مقالے پیش کیے۔ اس موقعے پر پروفیسر طاہر محمود، مظہر امام، مولانا جنید احمد بنارسی، مولانا عمیر الصدیق دریابادی، اشہر ہاشمی اور ڈاکٹر ظفر خلیل محمود سمیت بڑی تعداد میں لوگ شریک ہوئے۔ اجلاس میں مولانا عبدالماجد دریابادی کی بیٹی اور ڈاکٹر ہاشم قدوائی کی بیوی زہیرہ قدوائی کے لیے مغفرت کی دعا بھی کی گئی جن کا چند روز قبل انتقال ہو گیا تھا۔ اس موقعے پر مولانا عطاالرحمٰن قاسمی کی کتاب "امام شاہ ولی اللہ اور ان کے افکار و نظریات" مولانا منت اللہ رحمانی (مرحوم) کی کتاب "مسلم پرسنل لا اور یونیفارم سول کوڈ" کا اجرا بھی کیا گیا۔ (قومی آواز، دہلی)

بین الاقوامی غالب سمینار اور جلسۂ تقسیم غالب انعامات

● نئی دہلی، 26 ردسمبر۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیرِ اہتمام ایوانِ غالب میں بین الاقوامی غالب سمینار کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر مختلف ادبی شخصیات کو غالب انعامات سے نوازا گیا۔ تقریب کی صدارت ہریانہ کے گورنر ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی نے کی جب کہ غالب سمینار کا افتتاح جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر پروفیسر مشیر الحسن نے کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی کے ہاتھوں پروفیسر سید محمد عقیل رضوی کو مجموعی ادبی خدمات، دیویندر اسر کو اردو نثر، عزیز قریشی کو اردو ڈرامہ، محمد خلیل کو علمی خدمات "سائنس" کے لیے غالب انعام 2004 سے سرفراز کیا گیا۔

اس موقعے پر جناب عباس کے مرتب کردہ دیوانِ غالب (ہندی) پاکٹ سائز، مالک رام کے دیوانِ غالب (اردو) پاکٹ سائز، پروفیسر اسلوب احمد انصاری کی غالب جدید تنقیدی تناظرات، زبیر رضوی کی غالب اور فنون لطیفہ، پروفیسر نذیر احمد کی مرتبہ یوسف حسین خاں اور غلام ہمدانی مصحفی، ڈاکٹر خلیق انجم کی غالب کا سفر کلکتہ، شاہد ماہلی کی ادارت میں شائع ہونے والے رسالے غالب نامہ جنوری 2005 اور سراج الدین علی خاں آرزو وغیرہ کتب کا اجرا کیا گیا۔

"انیس و دبیر اور ان کا عہد" کے موضوع پر ہونے والے دو روزہ بین الاقوامی سمینار کے پہلے روز 3 اجلاس ہوئے جن کی صدارت بالترتیب سید محمد

عقیل رضوی، ضمیر اختر نقوی (پاکستان) اور پروفیسر قمر رئیس نے کی جب کہ نظامت کے فرائض بالترتیب ڈاکٹر رضا حیدر، ڈاکٹر شہزاد انجم اور ڈاکٹر علیم اشرف نے انجام دیے اور ڈاکٹر محمد محسن، ڈاکٹر ابن کنول، پروفیسر صغرا مہدی، مولانا عقیل الغروی، پروفیسر تقی حسین جعفری، پروفیسر ابوالکلام قاسمی، پروفیسر حنیف نقوی، سرور الہدیٰ، ڈاکٹر ماجد رضا عابدی (پاکستان)، ڈاکٹر رضا حیدر، ڈاکٹر کاظم علی خاں، ڈاکٹر ثروت النسا، پروفیسر اکبر حیدری کشمیری، ش.کاف.نظام نے مقالے پیش کیے۔

سمینار کے دوسرے روز تین اجلاس ہوئے جن کی صدارت بالترتیب پروفیسر عبیدالرحمٰن ہاشمی، پروفیسر محمد حسن اور پروفیسر شریف حسین قاسمی نے کی جبکہ نظامت بالترتیب سرور الہدیٰ، محترمہ وسیم راشد اور اشفاق عارفی نے کی اور پروفیسر کریم نجفی، ڈاکٹر ریحانہ خاتون، ڈاکٹر اقبال مرزا، پروفیسر زماں آزردہ، پروفیسر محمد حسن، پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر شارب ردولوی، پروفیسر سید محمد عقیل رضوی، ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی، خانم نادرہ جلالی، پروفیسر علی احمد فاطمی اور پروفیسر انیس اشفاق نے اپنے مقالے پڑھے۔ پروگرام کے آخر میں استاد اقبال احمد خاں نے سوزخوانی کی۔ بعدازاں مشاعرہ منعقد ہوا جس میں ندا فاضلی، شہریار، ولی بجنوری، پروفیسر مظفر حنفی، مخمور سعیدی، عقیل شاداب، ڈاکٹر اقبال مرزا (لندن)، راہی شہابی، ملکہ نسیم، منظور ہاشمی، ڈاکٹر ناشر نقوی، اعجاز پاپولر میرٹھی، پرتپال سنگھ بے تاب، آفاق فاخری، شکیل اعظمی، شمس تبریزی، افضل منگلوری، اکبر حیدرآبادی، ماجد رضا عابدی، ش.کاف.نظام، شاہد ماہلی و دیگر شعرا نے کلام پیش کیا۔ (راشٹریہ سہارا، دہلی)

تعلیمی کانفرنس

● بھیونڈی، یکم دسمبر۔ کوکن مسلم ایجوکیشن سوسائٹی کی پلاٹینم جوبلی تقریبات کے سلسلے میں غلام محمد مومن ویمنس کالج میں یک روزہ تعلیمی کانفرنس کا انعقاد ہوا جس کی صدارت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر سید حامد نے کی۔ انھوں نے مسلمانوں کے تعلیمی مسائل کے اہم پہلوؤں کو اُجاگر کیا اور ان مسائل کا حل بھی تجویز کیا۔ جناب سید حامد نے کہا کہ ہندستانی مسلمانوں میں دوسری قوموں کے مقابلے تعلیم کی بہت کمی ہے۔ اس لیے حصول تعلیم، صحت اور حفظان صحت اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی اشد ضرورت ہے۔ ہمارے عام تعلیمی معیار کو بہتر بنانے کے لیے جو کوشش ہونی چاہیے وہ ابھی تک نہیں ہوسکی۔ انھوں نے ریاست میں مسلمانوں کے ایک ایسے ادارے کے قیام کی ضرورت پر زور دیا جو پوری ریاست کے تعلیمی اداروں کا محاسبہ کرے۔ انھوں نے مزید کہا کہ بچوں کی کامیابی کے لیے لازمی ہے کہ ہم اسکولوں میں اصلاحی جماعتوں اور انگریزی بول چال کی کلاسیز شروع کریں تاکہ وہ دیگر اسٹریم کے بچوں کے ہم پلہ ہوسکیں۔

اس موقعے پر ڈاکٹر عبدالستار دلوی نے ''جدید تعلیم، عصری معنویت اور مسلمان'' کے زیر عنوان مقالہ پیش کرتے ہوئے سماجی زندگی کی بہتری کے لیے تعلیم کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر غلام نبی مومن نے ''نصاب تعلیم اور یکجہتی'' کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ بچوں کی بہتر تعلیم سے کسی بھی ملک کا روشن مستقبل وابستہ ہوتا ہے۔ فرقہ پرستی، علاقہ پرستی، لسانی عصبیت کو بڑھاوا دینے والی قوتوں کو ختم کرنے کے لیے قومی یک جہتی پر مشتمل نصاب تعلیم کا نفاذ ہونا چاہیے۔

''مہاراشٹر میں اردو تعلیم، جائزے اور امکانات'' کے موضوع پر محمد حسن فاروقی نے تحقیقی مقالہ پیش کیا۔ ڈاکٹر انور معظم نے ''اردو تعلیم اور روزگار کے مسائل'' پر گفتگو کرتے ہوئے اردو تعلیم سے تعلق رکھنے والے عصری تقاضوں پر جگہ جگہ ورک شاپ منعقد کرنے کی تجویز پیش کی۔ پروفیسر رفیع انصاری نے پروگرام کی نظامت کے فرائض انجام دیے۔ سوسائٹی کے اعزازی جنرل سکریٹری ڈاکٹر مصدق پٹیل نے تمام مہمانوں اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

عبداللہ حسین کو استقبالیہ

● نئی دہلی، 21 دسمبر۔ اردو فکشن کی ممتاز اور سربرآوردہ شخصیت جناب عبداللہ حسین کی آمد پر جامعہ ملیہ اسلامیہ میں استقبالیہ جلسے کا اہتمام کیا گیا جس میں اردو کے ممتاز دانشوروں نے ان کی عظیم ادبی خدمات پر خراج تحسین پیش کیا۔ جامعہ ملیہ کے سابق وائس چانسلر سید شاہد مہدی کی صدارت میں ہونے والے اس جلسے میں خود عبداللہ حسین نے تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک بڑی تفصیل کے ساتھ اپنے ذہنی و تخلیقی سفر پر نہایت موثر اور دلنشیں انداز میں اظہار خیال کیا۔ اپنے عالمی شہرت یافتہ ناول ''اداس نسلیں'' کے حوالے سے انھوں نے کہا کہ میں نے تو محبت کی کہانی لکھی تھی لیکن لوگوں نے اسے تاریخی اور نہ جانے کیا کیا کچھ سمجھ کر پڑھا۔ انھوں نے کہا کہ میں سوچتا پنجابی اور انگریزی میں ہوں اور لکھتا ہوں اردو میں۔

اس موقعے پر پروفیسر قمر رئیس، جوگیندر پال، پروفیسر شمیم حنفی، محمود ہاشمی، پروفیسر تقی حسین جعفری اور کمال احمد صدیقی نے عبداللہ حسین کے فکروفن پر روشنی ڈالی۔ سید شاہد مہدی نے عبداللہ حسین کے تخلیقی کارناموں میں اخلاقیات کی کیفیت کی طرف اشارہ کیا۔ صدر شعبۂ اردو قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی نے ''اداس نسلیں'' کو فنی اور تخلیقی امکانات کی تجسیم کاری کا ایک لازوال نقش قرار دیا۔ ڈاکٹر شہپر رسول نے جلسے کی نظامت کی۔ اس جلسے میں طلبہ کے علاوہ جن بعض اہم شخصیات نے شرکت کی ان میں پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، پروفیسر عبید صدیقی، پروفیسر جمال ملک، بشریٰ اقبال (جرمنی)، بیدار بخت (کناڈا)، خواجہ حسن ثانی نظامی، مسعود الحق، ڈاکٹر ارتضیٰ کریم، ڈاکٹر وہاج الدین علوی، ڈاکٹر شہناز انجم، ڈاکٹر شہزاد انجم، ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی اور ڈاکٹر توقیر احمد خاں کے نام قابل ذکر ہیں۔ (راشٹریہ سہارا، دہلی)

غالب کی شعری تراکیب پر ورکشاپ

● نئی دہلی، 10 دسمبر۔ اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سینٹر لکھنؤ اور شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام "غالب کی شعری تراکیب" پر ہفت روزہ ورکشاپ کا اختتامی اجلاس پروفیسر محمد ذاکر کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی بطور مہمان خصوصی شریک ہوئے۔ پروفیسر محمد ذاکر نے اسے ایک خوش آئند قدم قرار دیتے ہوئے اس دائرے کو اور وسیع کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی نے فرہنگ سازی کو ایک مشکل کام سے تعبیر کیا اور کہا کہ لغت تیار کرنے والے کی بے پناہ محنت کے باوجود کچھ نہ کچھ خامیاں رہ جاتی ہیں۔ پروفیسر شمیم حنفی نے کہا کہ غالب کے شعری مرکبات کی فرہنگ سازی سے لوگوں میں متن کی رغبت پیدا ہوگی۔ صدر شعبۂ اردو پروفیسر قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی نے کہا کہ شاعری کا بڑا تجربہ آسانی سے کسی لغت کی قید میں نہیں آسکتا لیکن اس کے باوجود آج کا کام غالب کی شاعری کی کلید ضرور ہوسکتا ہے۔

اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سینٹر کے پرنسپل ڈاکٹر غضنفر نے ہفت روزہ ورکشاپ کے اختتام پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مختلف زبانوں میں غالب کو پڑھا جارہا ہے مگر اس کے مرکبات پر اب تک کوئی کام نہیں ہوا ہے۔ 511 صفحات کا یہ کام تقریباً 3 ہزار مرکبات پر مشتمل ہے۔ ورکشاپ کے کوآرڈینیٹر ڈاکٹر شہپر رسول نے جلسے کی نظامت کی اور شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ شرکا میں ڈاکٹر خالد محمود، ڈاکٹر شہناز انجم، ڈاکٹر وہاج الدین علوی، انجم عثمانی، فرحت احساس، ڈاکٹر شہزاد انجم، حسام الدین فاروقی، سہیل احمد فاروقی، ڈاکٹر مظہر احمد، ڈاکٹر مولا بخش اسیر، ڈاکٹر احمد محفوظ، ڈاکٹر سراج اجملی، ڈاکٹر کوثر مظہری، خالد جاوید، ڈاکٹر نجمہ رحمانی، ڈاکٹر شکیل احمد جہانگیری، ڈاکٹر ابوبکر عباد، ڈاکٹر ندیم احمد، ڈاکٹر عبید الرحمٰن، ڈاکٹر ابرار رحمانی، ڈاکٹر محمد علیم، ڈاکٹر عبد الستار، ڈاکٹر رحیل صدیقی، زاہد الحق، عمیر منظر اور رضوانہ کے نام شامل ہیں۔ (راشٹریہ سہارا، دہلی)

اسکرپٹ رائٹنگ پر ورکشاپ

● میرٹھ، 20 دسمبر۔ چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کے انسٹی ٹیوٹ آف جرنلزم اینڈ ماس کمیونی کیشن میں "اسکرپٹ رائٹنگ" پر منعقدہ سہ روزہ ورکشاپ کے افتتاحی اجلاس میں ممتاز صحافی اور اسکرپٹ رائٹر مسٹر ریوتی سرن شرما اور منوہر شیام جوشی نے بطور خاص شرکت کی۔ ریوتی سرن شرما نے اس موقعے پر کہا کہ پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا کی جان اسکرپٹ ہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اسکرپٹ سے ہی تصویر کاری کو حسن بخشا جاتا ہے۔ منوہر شیام جوشی نے کہا کہ موجودہ عہد میں لوگ رقص اور جسم کی نمائش کو ترجیح دینے لگے ہیں۔ اس لیے اچھی سے اچھی فلمیں چل نہیں پاتیں۔ انھوں نے اس سوچ سے باہر نکلنے پر خاص توجہ دینے کی ضرورت پر زور دیا۔ اس موقعے پر انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ میڈیا کے طلبہ و طالبات کو تھیوری سے زیادہ پریکٹیکل کی طرف راغب کرانے کی ضرورت ہے۔ اس ورکشاپ میں ڈاکٹر منوج مشرا، زیندر کمار اور ڈاکٹر مشتاق صدف کے علاوہ یونیورسٹی اور متعلقہ شعبے کے طلبہ و طالبات کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ (ڈاک سے)

انجمن اساتذہ جامعات کا جلسہ

● نئی دہلی، 28 دسمبر۔ اساتذہ جامعات ہند کی میٹنگ راجستھان یونیورسٹی جے پور کے شعبۂ اردو کے پروفیسر فیروز احمد کی صدارت میں ہوئی جس میں شرکا نے ملک کی مختلف یونیورسٹیوں اور کالجوں میں خالی پڑی اردو اسامیاں فوری طور پر پُر کرنے کا مطالبہ کیا تاکہ اردو کی تعلیم میں آنے والی رکاوٹ دور ہوسکے۔ جلسے میں یہ بھی مطالبہ کیا گیا کہ اردو سے متعلق گجرال کمیٹی کی سفارشات پر عمل درآمد کیا جائے اور سرکاری مدارس میں جہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد خاطر خواہ ہے وہاں کم سے کم تین اردو اساتذہ مقرر کیے جائیں۔ انجمن نے قومی سطح کے سرکاری اور نیم سرکاری اداروں میں اردو جاننے والے ملازموں کی تقرری اور اردو تعلیم کو موثر ترین بنانے کے لیے تربیتی کالجوں میں اردو اساتذہ کی تربیت کے معقول نظم پر بھی زور دیا۔

اس موقعے پر پروفیسر صادق صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی، ڈاکٹر ابن کنول، ڈاکٹر ارجمند آرا، ڈاکٹر ابوبکر عباد، ڈاکٹر محمد کاظم اور ڈاکٹر نجمہ رحمانی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ انجمن کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر علی جاوید نے انجمن کی سرگرمیوں کی تفصیل پیش کی۔ (قومی آواز، دہلی)

مذاکرہ "عہدِ حاضر میں باغ و بہار کی معنویت"

● گورکھپور، 30 نومبر۔ "عہدِ حاضر میں باغ و بہار کی معنویت" کے موضوع پر شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی میں سمینار منعقد ہوا جس کا افتتاح صدر شعبہ پروفیسر افغان اللہ خاں نے کیا۔ سمینار کے کنوینر ڈاکٹر رضی الرحمٰن نے اس کی غرض و غایت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ طلبہ و طالبات کی تخلیقی، تنقیدی اور تحقیقی صلاحیتوں کو جلا بخشنے اور انھیں صحیح سمت و رفتار عطا کرنے کے لیے اس طرح کے سمینار انتہائی ضروری ہیں۔

سمینار میں رفعت آرا نے "فورٹ ولیم کالج کی تاریخ اور ادب پر اس کے اثرات"، فرید احمد نے "باغ و بہار کی نثر کی عصری معنویت"، عائشہ خاتون نے "باغ و بہار کا تہذیبی و سماجی پس منظر"، اشرف علی نے "باغ و بہار کے کردار" اور نجمہ خاتون نے 'باغ و بہار کا قصہ' کے عنوان سے اپنے مقالے پیش کیے۔ شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر اکبر علی بلگرامی، ڈاکٹر درخشاں تاجور، ملک جاوید انور نے

مقالوں پر اظہارِ خیال کیا۔ پروفیسر افغان اللہ خاں نے کہا کہ اس سمینار سے شعبۂ اردو میں ایک نئی فضا قائم ہوگی اور طلبہ و طالبات کی صلاحیتوں کو نکھرنے اور ابھرنے کا موقع ملے گا۔ سمینار کے اختتام پر ایم اے سال اوّل کی طالبہ ماریہ طفیل نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور نظامت ایم اے سال اوّل کے طالب علم عبدالرحمٰن نے کی۔ (ڈاک سے)

مرزا غالب پر مذاکرہ

● جودھپور۔ ''بزمِ اردو'' کے زیرِ اہتمام غالب کے یومِ پیدائش کے موقعے پر'' غالب۔ میری نظر میں'' مذاکرے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت جے نرائن ویاس یونیورسٹی کے شعبۂ ہندی کے سابق صدر رام پرساد دادھیچ نے کی۔ مہمانِ خصوصی قاضی محمد ایوب انصاری اور شمین میم حنیف تھے۔ تقریب میں مختلف زبانوں کے شعرا اور قارئین نے غالب کے فن اور شخصیت کے متعلق خیالات کا اظہار کیا۔

اس موقعے پر پروفیسر دادھیچ نے کہا کہ'' شاعر کو شاعری کے تناظر میں دیکھنا اور پرکھنا چاہیے اور اس نظریے سے غالب ہندستانی تہذیب اور روایت کے شاعر ہیں۔ قاضی محمد ایوب انصاری نے دیوانِ غالب کے انگریزی ترجمے کے حوالے سے غالب کی فنی خصوصیات پر روشنی ڈالی۔ شمین میم حنیف نے کہا کہ'' ہر دور کا قاری غالب کو اپنے انداز سے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور غالب کی پہلودار شخصیت کی نئی خوبیاں سامنے آتی رہتی ہیں جو غالب کی عظمت میں اضافہ کرتی ہیں۔ ہندی کے نقاد ڈاکٹر سورج پالی وال نے کہا کہ'' غالب کو زبانوں اور سرحدوں میں قید نہیں کیا جاسکتا اور غالب کے بغیر ہندی زبان بھی ادھوری ہے۔ بزم کے سکریٹری ڈاکٹر نثار راہی نے کلامِ غالب کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ موجودہ عہد میں جب انسانیت زخمی ہے، غالب کی شاعری ہمیں جینے کا حوصلہ عطا کرتی ہے۔ جلسے میں اشراق الاسلام ماہر، محمد افضل جودھپوری، برجیش عنبر، پروفیسر کنھیا لال راج پروہت، سرفراز شاکر، شیلیندر پروہت اور جنگل بوہرا نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ بزم کے صدر مہیند رسانکھلا نے شکریہ ادا کیا اور نظامت کے فرائض مظاہر سلطان زئی نے ادا کیے۔ (ڈاک سے)

امریکہ میں اردو ہندی سیکھنے کے شوق میں اضافہ

● نئی دہلی، 10 رجنوری۔ اس وقت امریکی یونیورسٹیوں میں امریکہ جاکر بس جانے والے غیر ملکی تارکینِ وطن کے بچوں میں سب سے بڑی تعداد ہندستانیوں کی ہے۔ یہ صورتِ حال 2004 میں پیدا ہوئی ورنہ اس سے قبل یہ درجہ چینیوں کو حاصل تھا۔ اس بات کا انکشاف ڈاکٹر محمد جہانگیر وارثی نے کیا، جو کہ امریکہ کی کیلی فورنیا یونیورسٹی برکلے میں لسانیات کی تدریس سے وابستہ ہیں۔ اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر وارثی نے جو لسانیات سے متعلق کانفرنس میں شرکت کے لیے ہندستان آئے ہوئے ہیں، بتایا کہ 11 رستمبر کے بعد امریکہ میں جنوبی ایشیا پر زیادہ زور دیا جارہا ہے۔ امریکیوں میں نہ صرف ہندی اور اردو پڑھنے کا شوق اور پڑھانے کا رجحان بڑھا ہے بلکہ اب امریکی یونیورسٹیوں میں ان دونوں زبانوں کی الگ الگ تدریس کی بھی صورتیں نکالی گئی ہیں۔ جنوبی ایشیا کی زبان، تمدن اور روایات پر اعلا تعلیم حاصل کرنے کے لیے اسکالرشپ اور فیلوشپ بھی دی جارہی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ کم از کم 7 یونیورسٹیوں میں اردو ایک الگ زبان کے طور پر پڑھائی جارہی ہے اور 14 یونیورسٹیوں میں اب بھی ہندی اور اردو کو ایک زبان کے طور پر پڑھانے کا انتظام ہے۔ (قومی آواز دہلی)

[illegible]

● حیدرآباد 24 رنومبر: '' کسی بھی یونیورسٹی کی شناخت اس کی علمی و ادبی فضا سے قائم ہوتی ہے۔ لہٰذا اساتذہ اور طلبہ یونیورسٹی کی علمی و ادبی اور تحقیقی فضا میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔'' صدرِ جلسہ پروفیسر اے ایم پٹھان، وائس چانسلر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے شعبۂ اردو کے تحت بزمِ اردو اور مجلس زور (سمینار کمیٹی) کے افتتاحی اجلاس کو مخاطب کرتے ہوئے ان خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے خاص طور سے طلبہ سے کہا کہ طلبہ یہ بات ذہن نشین کرلیں کہ اگر وہ چار بنیادی مہارتوں (یعنی سننے، کہنے، لکھنے اور پڑھنے) پر قدرت حاصل کرلیں تو وہ کسی بھی مضمون اور زبان پر آسانی سے عبور حاصل کرسکتے ہیں۔''

بزمِ اردو اور مجلس زور کے افتتاحی اجلاس کا آغاز محمد ابراہیم متعلم ایم اے (اردو) کی تلاوتِ کلامِ پاک سے ہوا۔ پروفیسر خالد سعید نے اغراض و مقاصد بیان کیے۔ اس موقعے پر صوفی ظفر شاہد نے'' رسم الخط میں تبدیلی کے مطالبے کے سیاسی و سماجی پہلو'' اور نور جہاں نے'' ہندستان کی جدید زبانیں'' کے عنوان سے مضامین پیش کیے۔ افتتاحی اجلاس کے مہمانِ خصوصی جناب فاروق احمد، رجسٹرار، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی تھے۔

شعبے کی استاد ڈاکٹر مسرت جہاں نے شیخ الجامعہ اور رجسٹرار کا تعارف پیش کیا جبکہ ڈاکٹر شمس الہدیٰ دریابادی (استاد، شعبۂ اردو) نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ اس افتتاحی اجلاس میں یونیورسٹی کے تمام عہدیداران، دیگر شعبہ جات کے اساتذہ اور طلبہ و طالبات نے شرکت کی۔ (ڈاک سے)

[illegible]

● ادے پور، 28 ردسمبر۔ میرا گرلس پی.جی. کالج ادے پور کی'' بزمِ ادب'' اور تعمیری سوسائٹی کی جانب سے کالج میں لندن سے آئے ہوئے شاعر، ادیب اور ماہنامہ'' صدا'' کے ایڈیٹر ڈاکٹر اقبال مرزا کے اعزاز میں غالب کی

ہنامکہ کے موقعے پر مشاعرہ" بہ یادگار غالب" کا انعقاد کیا گیا جس میں اقبال مرزا، محترمہ ملکہ نسیم، عابد ادیب، اقبال ساگر، مکیش اجمیری، ڈاکٹر ثروت خان، محترمہ زہرہ خان اور شگفتہ نے اپنا اپنا کلام پیش کیا۔ صدارت پروفیسر شفیع اگوانی، سابق وائس چانسلر، جے این یو، دلی نے کی۔ مہمان اعزازی ڈاکٹر اقبال مرزا اور مہمان خصوصی پروفیسر علی احمد فاطمی تھے۔ دوسرے دن 29 دسمبر کو کالج ہال میں ثروت خان کے افسانوی مجموعے "ذرّوں کی حرارت" پر مذاکرہ ہوا۔ صدارت اقبال مرزا نے کی، مہمان خصوصی پروفیسر علی احمد فاطمی تھے۔ اس موقعے پر محترمہ ملکہ نسیم، زہرا خان، شاہد پٹھان اور شاہد عزیز نے مقالے پڑھے اور اپنے تاثرات پیش کیے۔

پروفیسر علی احمد فاطمی نے ثروت خان کی کہانیوں کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ "ثروت خان کے یہاں اعلا درجے کی تخلیقی صلاحیت ملتی ہے۔ دورِ حاضرہ کی پُر پیچ زندگی کی حقیقتوں اور انسانی وجود خاص طور سے عورت کی نفسیات کی تہ در تہ سچائیوں کو اپنے تخلیقی انہماک سے بیان کرنے پر قدرت رکھتی ہیں۔ اسی کے ساتھ انھوں نے راجستھانی کلچر کو اپنی کہانیوں کے تانے بانے میں بڑے سلیقے سے پیش کیا ہے۔ بلاشبہ یہ اردو ادب میں اضافہ ہے۔ ان کی زبان میں مقامی بولیوں میواڑی اور مارواڑی کی چاشنی بھی نظر آتی ہے۔" (ڈاک سے)

اردو تعلیمی کیمپ کا انعقاد

سورت، 14 دسمبر۔ مجلسِ دعوت الحق، سورت کے زیرِ اہتمام قلیل مدتی اردو تعلیمی کیمپ کا انعقاد کیا گیا جس کی نگرانی ماہرِ تعلیم پروفیسر ڈاکٹر محمد زبیر قریشی نے کی۔ اس کیمپ میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان سورت سینٹر کے طلبہ و طالبات و دیگر شائقینِ اردو نے حصہ لیا اور صرف 7 روز کی مختصر مدت میں اردو لکھنے پڑھنے کی صلاحیت پیدا کی۔ ڈاکٹر محمد زبیر قریشی نے اپنے تدریسی تجربات کی روشنی میں نہایت قلیل مدت میں اردو زبان کی تعلیم کا ایک سہل اور انوکھا طریقہ ایجاد کیا ہے جس سے طلبہ صرف ایک ہفتے میں اردو لکھنے پڑھنے پر قدرت حاصل کرلیتے ہیں۔ سورت، بڑودہ، آنند اور گودھرا کے علاوہ گجرات کے دیگر شہروں میں متعدد طلبہ و طالبات اس جدید طریقۂ کار سے استفادہ کررہے ہیں۔ ان میں زیادہ تر تعداد غیر مسلم طلبہ و طالبات کی ہے۔ (راشٹریہ سہارا، دہلی)

کٹک میں ادبی جلسہ

● کٹک، 12 دسمبر۔ بزم احباب کی تنقیدی مجلس دولت کدۂ پیر محمد نظر، واقع دیوان بازار میں منعقد کی گئی جس کی صدارت شاعر و نقاد پروفیسر کرامت علی کرامت نے کی اور نظامت کے فرائض بزم کے کنوینر جناب خاور نقیب نے انجام دیے۔ شہزادہ ظفر کی غزل پر تنقیدی بحث کا آغاز ہوا بعد ازاں عبدالمتین جامی کی نثری نظم "ڈائنوسور" اور ڈاکٹر اختر حسین شانی کے مضمون "تخلیقیت کیا ہے۔ ایک محاسبہ" پر شرکا نے اظہار خیال کیا۔ ڈاکٹر کرامت علی کرامت، سعید رحمانی، ڈاکٹر اختر حسین شانی، ڈاکٹر حفیظ اللہ نیولپوری، عبدالمتین جامی، خاور نقیب، عبدالحق جتاب وغیرہ نے بحث میں حصہ لیا۔ (ڈاک سے)

انعامات و اعزازات

سلام بن رزّاق ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے سرفراز

● نئی دہلی، 22 دسمبر۔ اردو کے مشہور افسانہ نگار سلام بن رزّاق اور ہندی کے ممتاز شاعر ویرین ڈنگوال سمیت ہندستانی زبان کے 22 قلمکاروں کو سال 2004 کے لیے ساہتیہ اکادمی کے ایوارڈز سے نوازے جانے کا اعلان کردیا گیا ہے۔ جناب سلام بن رزّاق کو ان کی کہانیوں کے مجموعے "شکستہ بتوں کے درمیاں" کے لیے ایوارڈ دیا گیا ہے۔ اردو کے سلیکٹروں میں شہریار، وارث کرمانی اور شمیم طارق تھے۔ اتر پردیش کے بریلی میں رہنے والے مسٹر ڈنگوال کو ان کے دوسرے مجموعہ کلام "دُش چکر میں سرشٹا" کے لیے یہ ایوارڈ دیا گیا ہے۔ ہر زبان کی سہ رکنی سلیکشن کمیٹی نے ان ناموں کا انتخاب کیا۔ یہ ایوارڈ یکم جنوری 2000 اور 31 دسمبر 2002 کے درمیان شائع شدہ کتابوں کے لیے دیے گئے ہیں۔ اس ایوارڈ میں 50 ہزار روپے نقد اور توصیفی سند شامل ہے۔

دیگر ایوارڈ یافتگان ہیں — چندر بھان سنگھ (میتھلی)، شکنتلا اپنیو چٹرجی (انگریزی) سدھیر چکرورتی (بنگلا)، شیوناتھ (ڈوگری)، آتموال برگیڈ (گجراتی)، گیتا ناگ بھوشن (کنڑ) غلام نبی فراق (کشمیری)، پال زکریا (ملیالم)، سدانند دیشمکھ (مراٹھی)، جوس یوجن (نیپالی)، پرفل کمار موہنتی (اوڑیا)، سجیدر سنگھ نور (پنجابی)، نند بھاردواج (راجستھانی)، کلپناتھ شاستری (سنسکرت)، جنیش روہرا (سندھی)، تمسلمن (تمل) اور لوین (تیلگو)۔

(قومی آواز، دہلی)

ڈاکٹر تنویر احمد علوی کو بہادر شاہ ظفر ایوارڈ

● نئی دہلی، 28 دسمبر۔ دہلی اردو اکادمی کا سب سے بڑا ایوارڈ اس مرتبہ معروف نقاد اور محقق ڈاکٹر تنویر احمد علوی کو ان کی مجموعی ادبی خدمات کے لیے دیا گیا ہے۔ انھیں 2004 کے بہادر شاہ ظفر ایوارڈ کے لیے منتخب کیا گیا ہے جو ایک لاکھ گیارہ ہزار ایک سو گیارہ روپے، شیلڈ، توصیفی سند اور شال پر مشتمل ہے۔ تحقیق و تنقید کا ایوارڈ مشہور نقاد محمود ہاشمی کو دینے کا اعلان کیا گیا ہے جس میں 21 ہزار روپے سند، شیلڈ اور شال پیش کیے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ ایوارڈ برائے تخلیقی ادب مشہور افسانہ نگار بلراج ورما، برائے شاعری وقار مانوی، برائے طنز و مزاح

معین اعجاز، برائے خطاطی ذکیرالدین، برائے صحافت عزیز برنی، برائے ترجمہ یوگندر بالی، برائے لسانی یکجہتی سرجیت سنگھ لانبا، برائے الیکٹرانک میڈیا انیس صدیقی اور برائے بہترین استاد راحت سلطانہ (سینئر اسکولز) اور ریاضت علی شائق (پرائمری اسکولز) کو دینے کا اعلان کیا گیا ہے۔ ان ایوارڈز کا فیصلہ اکادمی کے وائس چیئرمین م. افضل کی صدارت میں منعقدہ ایوارڈ و کلچرل سب کمیٹی کی نشست میں ہوا جس کے کنوینر سید شریف الحسن نقوی ہیں۔ (قومی آواز، دہلی)

مولانا محمد علی جوہر ایوارڈ

● نئی دہلی، 10 دسمبر۔ مولانا محمد علی جوہر اکادمی کے زیر اہتمام مولانا محمد علی جوہر کے 126 ویں یوم ولادت پر تقسیم ایوارڈ کا جلسہ غالب اکادمی بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی میں زیر صدارت ڈاکٹر فاروق عبداللہ سابق وزیر اعلا جموں و کشمیر منعقد کیا گیا۔ تنظیم کے جنرل سکریٹری ایم سلیم نے اکادمی کا تعارف کرایا اور صدر پروفیسر اختر الواسع نے معزز مہمانوں اور ایوارڈ یافتگان کا خیر مقدم اور تعارف پیش کیا۔ مہمانِ خصوصی جناب بی ایل جوشی لیفٹیننٹ گورنر، دہلی نے اپنے دستِ مبارک سے جناب ایچ آر بھاردواج مرکزی وزیر قانون و انصاف، سید شاہد مہدی سابق وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ، محترمہ انیسہ بیگم مرزا میسر احمد آباد، جناب شہریار اردو شاعر، جناب رحمان نیر مدیر ماہنامہ "بیسویں صدی"، جناب جگدیش اگروال لائنس کلب انٹرنیشنل کو محمد علی جوہر ایوارڈ سے سرفراز کیا۔ مہمان ذی وقار کی حیثیت سے مولانا احمد مصطفٰی صدیقی راہی، جناب م. افضل وائس چیئرمین اردو اکادمی دہلی نے شرکت کی۔ آخر میں پروفیسر اختر الواسع نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

میکش اکبرآبادی ایوارڈ

● آگرہ، 20 دسمبر۔ معروف شاعر اور ادیب پروفیسر ملک زادہ منظور احمد کو سال رواں کے میکش اکبرآبادی ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔ اس تقریب میں ملک کے کئی نامور ادیبوں نے حصہ لیا، جن میں مرغوب الزماں، اقبال مرزا اور غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی کے ڈائرکٹر شاہد ماہلی شامل تھے۔ اس موقعے پر اپنی تقریر میں پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے آگرہ کے ادبی پس منظر میں غالب، نظیر اکبرآبادی، سیماب اور میکش کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ اکبرآباد اردو شعر و ادب کا ایک اہم مرکز رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ آزادی کے بعد اردو زبان رفتہ رفتہ زوال پذیر ہوئی ہے اور اب یہ نئی نسل کی ذمے داری ہے کہ وہ اس مشترکہ تہذیبی ورثے کی جس نے قومی یکجہتی اور جذباتی ہم آہنگی میں اپنا بھرپور کردار ادا کیا ہے، ترویج و اشاعت اور تحفظ کی ذمے داری قبول کریں۔ (راشٹریہ سہارا، دہلی)

تقسیم اسناد کے جلسے

● حیدرآباد، 9 دسمبر۔ جلسۂ تقسیم اسناد اور کوچنگ کلاسیز کے افتتاح کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے ریاستی حکومت کے محکمۂ فنانس کے پرنسپل سکریٹری آئی. وائی. آر کرشنا راؤ نے کل ہند اُردو تعلیمی کمیٹی و صدر کالج ڈیولپمنٹ کمیٹی کی طرف سے گورنمنٹ جونیر کالج، ناپلی میں کہا کہ حکومت اُردو زبان کی ترقی اور لڑکیوں کی تعلیم کے سلسلے میں ہر طرح کی حوصلہ افزائی کے لیے پابندِ عہد ہے۔ اس تقریب کی صدارت صدر کل ہند اُردو تعلیمی کمیٹی جناب جلیل پاشا نے کی۔

ڈاکٹر روپ کرشن بھٹ، پرنسپل پبلی کیشن آفیسر قومی اردو کونسل نے جلسے میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ انھوں نے کہا کہ اردو کو ٹیکنالوجی تعلیم سے مربوط کرنے کی ضرورت ہے تاکہ طلبہ و طالبات کے لیے روزگار کے امکانات میں اضافہ ہو۔ انھوں نے کہا کہ کونسل کی جانب سے ملک میں 175 کمپیوٹر کے مراکز قائم کیے گئے ہیں جن میں 50 سینٹر ایسے ہیں جہاں تربیت حاصل کرنے والوں کو وظیفے بھی دیے جا رہے ہیں۔ انھوں نے اُردو کتاب میلے کے سلسلے میں کہا کہ اُردو داں عوام کو چاہیے کہ وہ کتابیں خریدیں اور اس کتاب میلے کو کامیاب بنائیں۔

انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن کی ریجنل ڈائرکٹر مسز لاہمانے اردو میڈیم طالبات کے لیے بڑے پیمانے پر ووکیشنل کورس شروع کرنے کی ضرورت پر زور دیا تاکہ تعلیم کے ساتھ ساتھ روزگار کی فراہمی کو یقینی بنایا جا سکے۔ مسٹر عابد صدیقی نیوز ایڈیٹر دوردرشن نے اپنی تقریر میں لڑکیوں کی تعلیم کو سماجی ترقی کی علامت قرار دیا۔

اس موقعے پر جناب محمد جلیل پاشا نے قومی اردو کونسل کے لیے 100 کروڑ روپے کے بجٹ کا مطالبہ کیا۔ پروفیسر محمد مقبول احمد ڈائرکٹر اقلیتی تعلیمی بہبود مسٹر فریدالدین، مسٹر لائق علی، مسز آر. لکشمی پرنسپل مولانا ابوالکلام میموریل جونیر کالج نا پلی، جناب پریم راج یادو اور نورالدین حیدری نے بھی جلسے سے خطاب کیا۔

اس موقعے پر مسٹر آئی. وائی. آر کرشنا راؤ اور پروفیسر روپ کرشن بھٹ پبلی کیشن آفیسر نے کمپیوٹرائزڈ کیلی گرافی ٹریننگ سینٹر برائے طالبات نا پلی کا معائنہ کیا اور کورس کے اسناد طالبات میں تقسیم کیے۔ اس موقعے پر کمپیوٹرائزڈ کیلی گرافی ٹریننگ سینٹر برائے طالبات نا پلی کی کمپیوٹر فیکلٹی محترمہ ناہید النسا، محترمہ ششما ٹھاکر، محترمہ طاہرہ صدیقہ اور طالبات کی کثیر تعداد موجود تھی۔ (ڈاک سے)

● پورٹ بلیر، 9 دسمبر۔ اسلامک کانفیڈنس سینٹر پورٹ بلیر، انڈمان میں قومی اردو کونسل کی طرف سے چلائے جا رہے کمپیوٹر سینٹر کے 2003-04 کے طلبہ و طالبات کے لیے جلسۂ تقسیم اسناد منعقد کیا گیا۔ اس تقریب کے مہمانانِ خصوصی جناب ایم ایس پلنی کمار، سکریٹری، انڈمان و نکوبار اسٹیٹ سوشل ویلفیئر

جوڑا اور جناب گووند راج (راز انڈمانی) مشہور صحافی و اردو شاعر تھے۔ جلسے کی صدارت جناب گووند راج نے کی۔ اس موقعے پر کمپیوٹرائزڈ کیلی گرافی ٹریننگ سینٹر کے انچارج جناب ایم کے محمد نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے ادارے کی غرض وغایت پر روشنی ڈالی۔

جناب ایم ایس ہلچی کمار کے ہاتھوں طلبہ و طالبات کو اسناد تقسیم کی گئیں۔ کمپیوٹر کلاس میں اوّل پوزیشن حاصل کرنے والی طالبہ سیما اسمٰعیل کو شیلڈ دیا گیا اور دوسری اور تیسری پوزیشن حاصل کرنے والے طالب علموں سلمیٰ بی بی اور عبدالحمید کو کتابوں اور سند امتیاز سے سرفراز کیا گیا۔ جناب ایم ایس ہلچی کمار نے اس بات پر اظہار مسرت کیا کہ یہ کمپیوٹر سینٹر تین سال سے کامیابی سے چل رہا ہے۔

طلبہ و طالبات کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے جناب گووند راج نے کہا کہ یہ انڈمان کا واحد مرکز ہے جہاں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ کوئی بھی زبان مذہب سے جڑی ہوئی نہیں ہے اور ان جزیروں میں ایک ایسا زمانہ گزرا ہے جب یہاں کے سرکاری دفتروں کا کام کاج اردو زبان میں ہوتا تھا۔ انھوں نے کہا کہ ان لوگوں کو بھی اردو سیکھنے کا موقع ملنا چاہیے جو زبان جاننے کی خاطر اردو سیکھنا چاہتے ہیں۔ خوش آئند پہلو یہ ہے کہ اسلامک ویلفیئر سوسائٹی نے قومی اردو کونسل کے توسط سے جو کمپیوٹر سینٹر قائم کیا ہے اس کا اہم مقصد یہ بھی ہے کہ زبانِ اردو کو فروغ ملے اور لوگوں میں دلچسپی پیدا ہو اور ساتھ ہی کونسل کا مقصد اس کورس کے ذریعے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو روزگار مہیا کرانا ہے۔

جناب پی کے محمد علی، صدر اسلامک ویلفیئر سوسائٹی نے اسناد یافتہ طلبہ و طالبات کو مبارکباد پیش کی۔ جلسے کا آغاز جناب فاروق عالم فلاحی کی تلاوت کلام پاک سے ہوا اور جناب پی کے زبیر پروائزر نے تمام حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

مشاعرہ

● گوا، 21 دسمبر۔ ساہتیہ اکادمی کی گولڈن جوبلی تقریبات کے تحت گوا کلا اکادمی آڈیٹوریم میں "آئینے" کے عنوان سے دو روزہ "فیسٹول آف پوئٹری اینڈ فلمز" کا اہتمام کیا گیا۔ پہلے دن منگیشکر کلا مندر میں کل ہند مشاعرہ و کوی سمیلن کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر اپنے صدارتی کلمات میں پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کہا کہ اردو مشاعرہ یہاں کی فضاؤں میں پہلی بار ہو رہا ہے جو ایک تاریخی قدم ہے۔ اس موقعے پر معروف شاعر اور گیت کار جناب گلزار مہمانِ خصوصی تھے۔ مشاعرے اور کوی سمیلن میں گلزار کے علاوہ شہریار، بلراج کومل، کے کے چند انندن، کنہیا لال نندن، مخمور سعیدی، ش.ک. نظام، شہباز ندیم، پاپولر میرٹھی اور معین شاداب وغیرہ نے شرکت کی۔ گلزار نے اپنی نظموں سے سامعین کا دل جیت لیا۔ اردو زبان کا حسن بیان کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ

"یہ کیسا عشق ہے اردو زباں کا
مزا گھلتا ہے لفظوں کا زباں پر
کہ جیسے پان میں مہنگا قوام گھلتا ہے
نشہ آتا ہے اردو بولنے میں"

یہ شبہ تھا کہ کونکنی اور مراٹھی کی فضا میں اردو شاعری کس حد تک سمجھی جائے گی لیکن سامعین کے جوش و خروش سے یہ اندازہ ہوا کہ اردو شاعری کا جادو دوسری زبانوں کے ماحول میں بھی سر چڑھ کر بولتا ہے۔ فیسٹول کے دوسرے روز بلیک باکس میں ڈاکیومنٹری فلم "فیسٹول" کے تحت مختلف زبانوں کی دستاویزی فلموں کی نمائش کی گئی، جن میں ملک راج آنند اور بھیشم ساہنی سمیت پانچ بڑے ادیبوں پر دستاویزی فلم دکھائی گئی۔ دریں اثنا مہمان شعرا کے اعزاز میں مانڈوی ندی اور بحیرۂ عرب میں شاندار کشتی پر "کروز" کا اہتمام کیا گیا۔ کونکنی زبان کے مقامی شعرا نے اپنا کلام پیش کیا۔ (راشٹریہ سہارا دہلی)

رسم اجرا

"رفیق منزل" کا اخلاقیات نمبر

● نئی دہلی، 11 رجنوری۔ غالب اکادمی میں ماہنامہ "رفیق منزل" کی خصوصی اشاعت اخلاقیات نمبر کا اجرا ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ ڈائرکٹر قومی اردو کونسل اور وائس چیئرمین دہلی اردو اکادمی مسٹر م. افضل کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ ابتدا میں اسٹوڈنٹس اسلامک آرگنائزیشن آف انڈیا کے صدر سید ضمیر قادری نے تنظیم کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ایس.آئی.او. اس ملک میں طلبہ و نوجوانوں کے درمیان اخلاقی اقدار کے فروغ کے لیے کام کر رہی ہے اور "رفیق منزل" کی یہ خصوصی اشاعت اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے اس موقعے پر تقریر کرتے ہوئے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے لٹریچر کو اخلاقیات کے باب میں حرف آخر قرار دیتے ہوئے عمل کی دنیا میں حسن اخلاق کا مظاہرہ کرنے پر زور دیا۔ مدیر ماہنامہ "پیش رفت" دہلی، ڈاکٹر عبدالباری نے کہا کہ مغرب سے ہمارا تصادم اسی بنیاد پر ہے کہ ہم مذہب کو اخلاقیات کی بنیاد مانتے ہیں۔

جناب م. افضل نے کہا کہ اردو زبان کی زبوں حالی کے اس دور میں اس قدر متنوع اور اچھوتے موضوعات پر اتنے زیادہ وقیع مضامین لکھوانا بہت مشکل کام تھا اور یہ کام شعبۂ ادارت نے بخوبی انجام دیا ہے۔ تقریب کی صدارت ڈاکٹر عبدالحق انصاری امیر جماعت اسلامی ہند نے کی۔ انھوں نے اخلاقیات پر

خصوصی اشاعت کو وقت کی اہم ضرورت قرار دیا۔ نظامت کے فرائض مدیر "رفیقِ منزل" محی الدین غازی نے انجام دیے۔ (ڈاک سے)

سرگوشیاں

● پونہ۔ مہاراشٹر راشٹر بھاشا سبھا کی طرف سے اندرا شبنم کے اردو شعری مجموعے "سرگوشیاں" اور ہندی مجموعے "دستک" کے اجرا کی تقریب منعقد ہوئی۔ "سرگوشیاں" کا اجرا ممتاز افسانہ نگار قاضی مشتاق احمد نے اور ہندی مجموعے کا اجرا ڈاکٹر داموور کھرے نے کیا۔ صدارت جناب ایس ایم شاہ نے کی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر وجے گپتا، رفیق جعفر نے مقالات پڑھے اور نذیر فتح پوری نے منظوم تبصرہ کیا۔

اس موقعے پر قاضی مشتاق احمد نے کہا کہ اردو اور ہندی کا باہمی تعلق صدیوں پرانا ہے لیکن آزادی کے بعد کے برسوں میں ان میں کچھ دوری ہو گئی تھی جو اب ختم ہو رہی ہے۔ اردو کے شعرا گیت، بھجن اور دوہے کہہ رہے ہیں اور ہندی کے شعرا غزل کہنے لگے ہیں۔ اس سے ہندی اور اردو کا گنگا جمنی سنگم ہو گیا ہے۔

ڈاکٹر داموور کھرے نے اردو اور ہندی شاعری کی موجودہ صورت حال پر تبصرہ کیا۔ جلسے میں اندرا شبنم نے اپنے تخلیقی کارناموں پر روشنی ڈالی۔ اس تقریب میں ہندی۔ اردو اور مراٹھی کے شعرا، ادبا اور دانشور بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ (ڈاک سے)

نئی پھلواری

● کھنڈوہ۔ انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ کھنڈوا کی طرف سے پروفیسر مظفر حنفی کے شعری مجموعے "آگ مصروف ہے" اور ڈاکٹر محبوب راہی کی نظموں کے مجموعے "نئی پھلواری (دوسرا ایڈیشن) کے اجرا کی تقریب معروف شاعر قاضی حسن رضا کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ مدھیہ پردیش اردو اکادمی کی شائع کردہ کتاب "آگ مصروف ہے" کا اجرا کرتے ہوئے قاضی حسن رضا اور پرنسپل حبیب عالم نے مظفر حنفی کے منفرد تخلیقی رویوں پر اظہار خیال کیا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی مالی امداد سے شائع ڈاکٹر محبوب راہی کے طفلی نظموں کے مجموعے "نئی پھلواری" کا اجرا کرتے ہوئے پروفیسر مظفر حنفی نے ادبِ اطفال میں محبوب راہی کی قابلِ قدر کارکردگی پر اظہار خیال کیا۔

اجرائی تقریب کے بعد شعری نشست کا انعقاد عمل میں آیا جس میں صدر مشاعرہ قاضی حسن رضا کے علاوہ مہمانانِ خصوصی پروفیسر مظفر حنفی اور ڈاکٹر محبوب راہی کے ساتھ ایس ایم جلیس، حمید دلکش، شیخ عبداللہ شیخ، صغیر مظفر، ہارون فراق، سفیان قاضی، گووند گیتے واحد، اکبر تاج اور رحیم راہی نے اپنا کلام پیش کیا۔ نظامت حبیب عالم نے کی جبکہ اظہار تشکر کے فرائض عبداللہ شیخ نے انجام دیے۔ (ڈاک سے)

جانے والوں کی یاد

پروفیسر عتیق احمد صدیقی

● علی گڑھ، 20 دسمبر۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں پروفیسر ریاض الرحمٰن شیروانی کی صدارت میں منعقدہ تعزیتی جلسے میں شعبے کے سابق صدر اور آرٹس فیکلٹی کے ڈین پروفیسر عتیق احمد صدیقی کے انتقال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا گیا۔ پروفیسر عتیق احمد صدیقی کئی کتابوں کے مصنف، مرتب اور مترجم تھے اور ان کے سو سے زائد مضامین مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے بنیادی کاموں میں قصائدِ سودا کا شمار ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ انتخاب مضامین سرسید، سرسید بازیافت، مراسلات سرسید، انتخاب الٰہی بخش معروف، انتخاب زمیندار، اشاریہ تنقید اور سید سلیمان ندوی، ان کی مرتب کردہ کتابیں ہیں۔ اسلام اور امن عالم اور اسلام اکیسویں صدی میں ان کی ترجمہ کی ہوئی کتابیں ہیں۔ وہ دین دار، پرہیزگار اور انتھک محنت کرنے والے اصول پسند انسان تھے۔ ان کی ادبی خدمات اور مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لیے کی گئی کوششیں ان کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔ اس تعزیتی جلسے میں پروفیسر مسعو عالم، پروفیسر نور الحسن نقوی، پروفیسر حکیم ظل الرحمٰن، پروفیسر مسعود الحسن اور پروفیسر قاضی افضال حسین نے ان کی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی اور انھیں خراج عقیدت پیش کیا۔ (راشٹریہ سہارا دہلی)

□□□

بونکی کے کپتان چاچا

مصنف: گلزار

گلزار کے قلم سے بے حد آسان اور عام فہم زبان میں
بچوں کے لیے ایک ایسی کہانی جس سے
باتوں باتوں میں کافی معلومات بھی حاصل ہو جاتی ہیں۔
صفحات: 68، قیمت: -/55 روپے

خواجہ میر درد

مصنف: ظہیر احمد صدیقی

خواجہ میر درد اردو کے سب سے بڑے صوفی شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ حالانکہ ان کے کلام میں تصوف کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ اس کتاب میں درد کے حالاتِ زندگی، ان کی تصانیف، شاعرانہ خصوصیات کے ساتھ ساتھ تصوف پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نوآموز طلبہ کے لیے ایک بہترین کتاب۔
صفحات: 64، قیمت: 14 روپے

تبصرہ وتعارف

دربار اکبری/ مولانا محمد حسین آزاد

صفحات: 927، قیمت:- /164 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1
آر. کے. پورم، نئی دہلی-66
مبصر: اظہار احمد ندیم

مولانا محمد حسین آزاد کو جہاں اردو ادب سے گہرا لگاؤ تھا وہیں انھیں ملک کا شاندار ماضی بھی بے حد عزیز تھا۔ مثال کے طور پر ان کی دو تصانیف "قصصِ ہند" اور "دربار اکبری" کا نام لیا جاسکتا ہے۔ دربار اکبری میں مولانا آزاد نے عہد اکبری کے سماجی، سیاسی، تہذیبی، ثقافتی، اقتصادی اور مذہبی مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے شہنشاہ اکبر کے بارے میں جو بعض اعتراض کیے جاتے ہیں ان پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ مولانا آزاد نے دربار اکبری لکھنے کے لیے ہمایوں نامہ، اکبر نامہ اور دیگر 37 کتابوں کے مطالعے کے علاوہ دوسری کتابوں سے بھی استفادہ کیا۔ حوالے کے طور پر دربار اکبری میں ملا عبدالقادر بدایونی کی کتاب "منتخب التواریخ" کا ذکر بار بار آیا ہے۔ "دربار اکبری" مولانا محمد حسین آزاد کی ضخیم ترین تصنیف ہے جس کو پہلی بار ان کے ایک عزیز شاگرد میر ممتاز علی نے مطبع رفاہ عام، لاہور سے اپنے مقدمے کے ساتھ شائع کیا۔ مولوی میر ممتاز نے دربار اکبری کے مسودے کے بارے میں اپنے مقدمے میں بہت ساری باتیں تحریر کی تھیں جن کو مولانا محمد حسین آزاد کے صاحبزادے محمد ابراہیم نے بے بنیاد قرار دیتے ہوئے "دربار اکبری" کا ایک الگ ایڈیشن 1910 میں شائع کیا۔ زیر نظر اشاعت کا متن عالمگیر الیکٹرک پریس، لاہور (دسمبر 1937) پر مبنی ہے جس کا دیباچہ پروفیسر محمد انصار اللہ نے لکھا ہے۔

"دربار اکبری" مولانا محمد حسین آزاد کی دیگر تصانیف کی طرح کوئی مربوط و مسلسل تاریخی کتاب نہیں ہے لیکن یہ جلال الدین محمد اکبر کے دربار، عہد اور اس کے حالات سے کافی حد تک متعارف کراتی ہے۔ "دربار اکبری" میں اکبر کے عہد کی تمام اہم شخصیتوں مثلاً بیرم خاں، فیضی، ابوالفضل، شیخ عبدالقادر بدایونی، ٹوڈرمل، مان سنگھ، عبدالرحیم خانخاناں وغیرہ کے حالات پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔ عہد اکبری کے تمام واقعات اور جنگوں کا ذکر بھی مولانا آزاد نے اس کتاب میں کیا ہے۔

مصنف نے عہد اکبری کے حوالے سے یہ ثابت کیا ہے کہ اکبر کے دور میں بلاتفریق عوام کی فلاح و بہبود کے لیے بہت سارے اقدام اٹھائے گئے۔ اکبر نے ہندوؤں کو اعلا منصب عطا کیے اور سیکولرزم کی بہترین مثالیں پیش کیں۔ اکبر ہندستان کا پہلا بادشاہ تھا جس نے عوام کو فکری و مذہبی آزادی عطا کی تھی۔ دین الٰہی کے بارے میں آزاد نے یہ لکھا ہے کہ اکبر نے علمائے شریعت کے غیر معمولی اقتدار کو توڑنے کے لیے بطور سیاست اس کا استعمال کیا تھا۔ اس دور میں فنون لطیفہ کی بہت ترقی ہوئی۔

فکر و خیال کے آداب سے لے کر زبان و بیان کے اصول سے متعلق مولانا آزاد نے "دربار اکبری" میں ایک سے بڑھ کر ایک باتیں بیان کی ہیں۔ مولانا آزاد نے "دربار اکبری" میں مغلیہ عہد سے تعلق رکھنے والی مختلف چیزوں کو اپنے مخصوص اسلوب میں بیان کیا ہے جس سے قاری کی دلچسپی بھی برقرار رہتی ہے اور اس کی معلومات میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

"دربار اکبری" کی زبان "آبِ حیات" سے مختلف ہے۔ اس میں فارسی الفاظ اور صنائع و بدائع کا استعمال کم ملتا ہے۔ اس کے باوجود مولانا آزاد "دربار اکبری" کے ذریعے ہمارا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے چار سو برس قبل کے ہندستان میں لیے چلے جاتے ہیں اور ہم اس دور کے ایک ایک منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے چلے جاتے ہیں۔ قومی اردو کونسل اس کی اشاعت کے لیے مبارکباد کی مستحق ہے۔

•

تعلیمی تشکیل نو کے مسائل

مصنف: خواجہ غلام السیدین، مترجم: ایم. ابوبکر
صفحات: 307، قیمت:- /96 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1
آر. کے. پورم، نئی دہلی-66
مبصر: سراج نقوی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے بنیادی اہمیت کی حامل کتابوں کی اشاعت کا جو مفید سلسلہ شروع کیا ہے، زیر تبصرہ کتاب اس کی اہم کڑی ہے۔ تعلیم کے شعبے میں خواجہ غلام السیدین کی تحریریں نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ درس و تدریس کے بنیادی ڈھانچے کے تعلق سے خواجہ صاحب کے نظریات اس شعبے میں سرگرم افراد کے لیے مشعل راہ ہیں۔ اردو میڈیم سے مختلف ٹیچنگ کورسیز کرنے والے طلبہ یا اردو تدریس کے پیشے سے وابستہ افراد کے لیے اس طرح کی کتابیں عام طور پر بازار میں دستیاب نہیں ہیں جو ان کے لیے معاون ثابت ہوسکیں۔ زیر تبصرہ

کتاب اس بڑی کمی کو پورا کرتی ہے۔ خواجہ صاحب کا خیال تھا کہ مستقبل کے مدرسے کی تعمیر و تشکیل اسکول کے اندر کی مادّی اور نفسیاتی زینت و آرائش کے مقابلے میں کہیں زیادہ اساسی اہمیت کی حامل ہے۔ وہ اسکول کو مجموعی سماجی ماحول کا ایک حقیقی جز مانتے تھے اور اس بات کے قائل تھے کہ بچے کی انفرادیت کا ارتقا تنہا اسکول کی چہار دیواری میں نہیں ہوتا بلکہ مجموعی طور پر وقت کے اقتصادی، سماجی ڈھانچے اور فکری تحریکات کا بڑا زبردست ہاتھ اس کے ڈھالنے میں ہوتا ہے۔ اسی لیے کتاب کے آغاز میں تعارف کے تحت وہ لکھتے ہیں کہ "تعلیمی اصلاح محض تعلیمی اصلاح کا کام نہیں ہے۔ یہ وسیع معنوں میں سماجی اصلاح اور اس کی جدید تعمیر کے مترادف ہے۔"

کتاب کو کل 21 ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے، جو دراصل 21 مضامین ہیں۔ 'پس منظر' کے تحت پہلا باب کتاب کی تصنیف کے مقاصد پر روشنی ڈالتا ہے۔ مضمون کے آغاز میں مصنف نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا ہے کہ ملک کے عام اسکول نوجوانوں کی فطری افتاد اور ان کی قیمتی اور قابلِ قدر صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں ناکام رہے ہیں۔ یہ ان کی تخلیقی قوتوں کے سرچشموں کو صحیح اور مفید سمت میں نہیں موڑ سکتے ہیں۔ خواجہ صاحب نے اس پورے مضمون میں اپنے دور کے نظامِ تعلیم اور اسکول کی افادیت پر جو سوالیہ نشان لگائے ہیں ان کا اطلاق موجودہ دور کے اسکولوں پر بھی بڑی حد تک ہوتا ہے۔ دوسرے باب "اسکول ایک سرگرم ماحول ہے" میں مصنف نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ مستقبل کے اسکول کا نقشہ کیسا ہو۔ خواجہ صاحب کا خیال ہے کہ "اگر بچے کو اسکول اور اسکول کے باہر موثر طور پر اظہارِ ذات سے کام لینا ہے تو ضروری ہے کہ اس کی قوتوں میں نظم و ضبط پیدا کیا جائے۔ تیسرے باب میں یہ بتایا گیا ہے کہ اسکول میں تخلیقی ماحول پیدا کرنے کے لیے کون سے قدم اٹھائے جائیں۔ ضمنی عنوانات مثلاً دستکاری یا حرفہ، اسکول سوسائٹی اور کلب، اسکول میگزین، اسکول کی نمائش وغیرہ کے تحت اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس کے علاوہ اسکول جماعتی زندگی کے مرکز کی حیثیت سے، تعلیم برائے مسرت، گاؤں میں تعلیم کا رول، بیسک تعلیم کی دین، ثانوی تعلیم کو کام کے ذریعے حیات تازہ بخشیے، ثانوی تعلیم کی تشکیل جدید، تعلیمِ بالغان جمہوری شہریت کے لیے، سماج میں معلم کی حیثیت، معلمین کی ٹریننگ کے بعض مسائل جیسے عنوانات کے تحت درس و تدریس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

مجموعی طور پر یہ کتاب درس و تدریس کے مسائل سے دلچسپی رکھنے والے ہر شخص کے لیے بے حد مفید اور کارآمد ہے۔ خصوصاً وہ لوگ جو خواجہ غلام السیدین کے تعلیمی نظریات سے واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں ان کے لیے یہ ایک بہترین تحفہ ہے۔ امید کہ طلبا و مدرسین اسے ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔

●

جدید سیاسی فکر / ڈاکٹر سید انوار الحق حقی

صفحات: 305، قیمت: -/120 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1

آر. کے. پورم، نئی دہلی-66

مبصر: سراج نقوی

دنیا جس تیزی سے ایک گلوبل گاؤں کی شکل میں بدلی ہے اس نے عام آدمی کی بھی بین الاقوامی معاملات میں دلچسپی بڑھا دی ہے۔ جدید تہذیب اور ترقی نے جمہوری قدروں کے استحکام کے ساتھ ساتھ پوری دنیا کے لوگوں میں ایک دوسرے کے سیاسی نظام اور سیاسی مفکرین کے نظریات کو سمجھنے کا تجسس پیدا کیا ہے۔ سیاسی نظریات کا مطالعہ آج ایک اہم موضوع کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ خصوصاً جن ممالک میں جمہوریت کی جڑیں کافی گہری ہیں وہاں مختلف سیاسی نظریات کے مطالعے کی اپنی اہمیت ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب اس اعتبار سے کافی اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں 19 ویں اور 20 ویں صدی کے اہم مغربی و مشرقی سیاسی مفکرین کے نظریات کو مختصر لیکن جامع انداز میں اردو کے قارئین کے سامنے پیش کر دیا گیا ہے۔ علمِ سیاسیات کے موضوع پر اردو میں کافی کم کتابیں ہیں اور اردو کے قاری کے لیے جدید سیاسی مفکرین کا انگریزی یا دیگر زبانوں میں مطالعہ کرنا ایک ٹیڑھی کھیر ہے۔ "جدید سیاسی فکر" اس کمی کو پورا کرنے کی سمت میں ایک قابلِ قدر کوشش قرار دی جا سکتی ہے۔

کتاب کی تمہید میں جدید سیاسی فکر کا پس منظر پیش کیا گیا ہے۔ مصنف نے جدید سیاسی فلسفے کے آغاز کا زمانہ سولھویں صدی عیسوی قرار دیا ہے (جو یورپ کی نشاۃِ ثانیہ کا زمانہ ہے۔) لیکن اسے چھٹی صدی قبل مسیح کے یونان کی فکر سے جوڑا ہے۔ مغرب کی تمام روایات کا گہوارہ قدیم یونان کو قرار دیا گیا ہے۔ مصنف کا خیال ہے کہ شہری اور تمدنی زندگی کے جن مسائل پر دو ہزار برس قبل افلاطون اور ارسطو نے جن خیالات کا اظہار کیا تھا ان کی معنویت اور اہمیت آج بھی باقی ہے۔

13 ابواب پر مشتمل زیرِ تبصرہ کتاب کا ہر باب کسی نہ کسی خاص سیاسی فلسفے یا نظریے سے بحث کرتا ہے اور اس سے متعلق مفکرین کے حالاتِ زندگی اور ان کی فکری نشو و نما پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔

پہلا باب "قدامت پسندی" کے سیاسی فلسفے سے متعلق ہے۔ مصنف کے مطابق یورپ میں 18 ویں صدی کا زمانہ روشن خیالی اور سائنسی عقلیت کا زمانہ تھا۔ اس روشن خیالی کے خلاف دو طرح کے ردِ عمل سامنے آئے ان میں ایک "قدامت پسندی" تھا اور ایڈمنڈ برک اس قدامت پسندانہ ردِ عمل کا ترجمان تھا۔ دوسرا باب "افادہ پسندی" کے سیاسی فلسفے پر روشنی ڈالتا ہے۔ فرد کی آزادی کو زیادہ اہمیت دینے والے اس نظریے کے اہم مفکرین میں بریمی بینتھم اور جان اسٹوارٹ مل جیسے سیاسی مفکرین شامل ہیں۔

''عینیت'' جس کے بانیوں میں ایمانویل کانٹ اور جارج ولیم فریڈرک ہیگل جیسے فلسفی شامل ہیں مملکت اور فرد کے رشتوں سے بحث کرتا ہے۔ ہربرٹ اسپنسر کا فلسفۂ ثبوتیت جو تضادات اور ذہنی انتشار سے پُر ہے مملکت کو محض منصفانہ انداز سے نگرانی کرنے والا ادارہ قرار دیتا ہے۔ جان آسٹن کے اصول قانون کے تحلیلی مکتب فکر پر ایک الگ باب میں بحث کی گئی ہے۔ لیکن سب سے زیادہ طویل اور تفصیلی بحث اشتراکی مکاتب فکر یا ں کے مخالف مکتب فکر پر ہے۔ ایک باب ''اشتراکیت اور دور حاضر کے اشتراکی مکاتب فکر'' عنوان سے ہے جبکہ دوسرا باب مارکسی اشتراکیت پر روشنی ڈالتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اشتراکیت نے جدید سیاسی فکر کو جتنا متاثر کیا ہے اتنا شاید ہی کسی دوسرے نظریے نے کیا ہو۔ ''غیر مارکسی اشتراکیت'' پر ایک الگ باب میں بحث کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ سیاسی تکثیریت، مملکت مخالف سریات اور جمہوریت مخالف نظریات پر بھی الگ الگ ابواب میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ جمہوریت مخالف نظریات میں فسطائیت کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، اسی لیے اس پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ فسطائیت کا لفظ ہماری سیاسی گفتگو اور مضامین میں کثرت سے استعمال ہوتا ہے لیکن اس سیاسی فکر کے بنیادی اصولوں اور تفصیل سے بہت کم لوگ واقف ہوں گے۔ اس اعتبار سے یہ مضمون خاص اہمیت کا حامل ہے۔ جارحانہ قوم پرستی پر مبنی اس نظریے کا رہنما اٹلی کے مطلق العنان حکمراں مسولینی کو مانا جاتا ہے۔ فسطائیت یا فاشزم میں مملکت کو تقدس کا درجہ حاصل ہے اور فرد پر واجب قرار دیا گیا ہے کہ وہ مملکت کی ہر بات مانے۔ فسطائیت انفرادی آزادی کے تصور کو قبول نہیں کرتی اور معیشت پر بھی مملکت کے مکمل کنٹرول کی قائل ہے۔ یہ نظریہ جمہوری اداروں میں اعتقاد نہیں رکھتا اور چند باصلاحیت لوگوں کو حکومت کرنے کا اہل مانتا ہے۔ مساوات انسانی میں عدم اعتقاد، نسلی اور قومی برتری، معقولیت اور ذہانت دشمنی، جنگ و قوت کی پرستش، سماجی ڈارونیت، روایت پرستی، جمہوریت دشمنی جیسی چیزوں کو فاشسٹ نظریے میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

کتاب کے آخری دو ابواب دو اہم ہندستانی سیاسی فلسفوں کی تشریح کرتے ہیں۔ ان دونوں ہی سیاسی فلسفوں نے آزادی کے بعد کے ہندستان پر واضح اثرات مرتب کیے ہیں اور ہندستانی سماج کو ایک نئی سمت دی ہے۔ پہلا سیاسی فلسفہ مہاتما گاندھی کا فلسفۂ عدم تشدد ہے جسے ''اہنسا اور ستیہ گرہ'' کے عنوان سے ایک الگ باب بنایا گیا ہے۔ ہندستان کی تحریک آزادی میں اہنسا اور ستیہ گرہ کا کیا رول رہا ہے اور آج بھی ہماری سیاسی زندگی میں اس کی کیا اہمیت ہے یہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ سچائی پر ڈٹے رہنے کی تعلیم دینے والا یہ فلسفہ روحانیت سے عبارت ہے۔ عدم تشدد یا اہنسا کو اس میں بنیادی اہمیت دی گئی ہے اور اصولاً یہ مملکت کے خلاف ہے۔

سب سے آخر میں ''سرودیہ'' کے نظریے پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ونوبا بھاوے کو ''سرودے تحریک'' کا بانی مانا جاتا ہے۔ یہ فلسفہ دراصل گاندھی جی کے سچائی، اہنسا اور جائز ذرائع کے اصولوں کو عملی شکل دے کر ایک نیا سماجی نظام قائم کرنا چاہتا ہے۔ غیر جماعتی جمہوریت، لامرکزیت، گرام راج، بھودان اور سمپتی دان کو اس نظریے میں خاص اہمیت دی گئی ہے۔

مذکورہ نظریات پر فاضل مصنفین نے بہت کھل اور سادہ انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ اس لیے کتاب سے قاری کی دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ قوی امکان ہے کہ سیاسی وسماجی موضوعات سے دلچسپی رکھنے والے قارئین میں اس کی پذیرائی ہوگی۔

•

ایک جزیرہ دھوپ کا (شاعری) / رمیندر جاکھو ساحل

صفحات: 128، قیمت:-/100 روپے

ناشر: بلھار پرکاشن، 54، سیکٹر 7، چنڈی گڑھ

مبصر: محمود سعیدی

رمیندر جاکھو ساحل ہریانہ کیڈر کے آئی اے ایس ہیں اور ان دنوں کانفیڈ (ہریانہ) کے مینجنگ ڈائرکٹر کے عہدے پر فائز ہیں۔ اس عہدے کی ذمے داریاں نبھانے کے ساتھ ساتھ وہ ہریانہ اردو اکادمی کے سکریٹری کے فرائض بھی ادا کرتے رہے ہیں۔ یہ فرائض انھیں اردو زبان و ادب سے ان کی گہری دلچسپی اور وابستگی کی وجہ سے سونپے گئے تھے۔ اسی دلچسپی اور وابستگی کا ثمرہ ان کی شاعری ہے۔ خود ان کے الفاظ میں انھوں نے ''جب سے ہوش سنبھالا ہے، ایک شعری کائنات کی دھوپ کو اپنے چاروں طرف چھایا ہوا پایا ہے جس کی روشنی میں زندگی کے کئی روپ نظر آتے ہیں۔'' انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ ''زندگی جیسی بھی میرے حصے میں آئی، میرے حصے کی غزل ہوگئی''۔ اس سے بجا طور پر یہ گمان گزرسکتا ہے کہ وہ صرف غزل کے شاعر ہیں اور شاعری ان کے لیے غزل کی ہم معنی ہے؛ لیکن زیر نظر مجموعے کے آخر میں ان کی کہی ہوئی کچھ نظمیں بھی شامل ہیں، اس لیے یہ کہنا شاید زیادہ درست ہوگا کہ ان کی پہلی ترجیح غزل ہے لیکن وہ نظم گوئی سے بھی برابر کا شغف رکھتے ہیں۔

رمیندر جاکھو ساحل کی شاعری بری مضامین سے زیادہ بوجھل نہیں ہے بلکہ بڑی حد تک ان کے نجی مشاہدات اور محسوسات کی آئینہ دار ہے اسی لیے ان کے اشعار پڑھ کر ایک طرح کی تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ کتاب کا پیش لفظ غزل کے مشہور شاعر ڈاکٹر بشیر بدر نے لکھا ہے جو ایک غزل کے مختلف اشعار کی طرح ہے جن میں معنوی ربط کی تلاش سعی لاحاصل ہوا کرتی ہے لیکن پیش لفظ کا مجموعی تاثر شاعر کے حق میں ہے اور اس کی شاعرانہ صلاحیت کا اثبات کرتا ہے۔ بشیر بدر نے ساحل صاحب کو غزل اور نظم پر یکساں قدرت رکھنے والا شاعر قرار دیا ہے اور یہ درست بھی ہے۔ ساحل صاحب جیسی اور جتنی دسترس غزل پر رکھتے ہیں، اتنی ہی نظم پر بھی۔

رمیندر جاکھو ساحل صرف دل کی نہیں دنیا کی بھی باتیں کرتے ہیں کہ جس دنیا میں وہ جی رہے ہیں، اس سے ان کا حساس دل بے تعلق نہیں رہ سکتا۔

درج ذیل چند اشعار سے جو مختلف غزلوں سے ماخوذ ہیں، ان کے رنگِ سخن کا کچھ اندازہ کیا جاسکتا ہے:

میں اتنا کھو گیا تھا خداؤں کی بھیڑ میں
اصلی خدا پہ میری نظر ہی پڑی نہیں

چہرے پہ اتنے چہرے لگائے کہ آخرش
چہرے ہی چہرے رہ گئے ہیں، آدمی نہیں

جب ترا خود سے سامنا ہوگا
وہ گھڑی حشر کی گھڑی ہوگی

موسم تو ٹھیک ٹھاک ہے، ہم ہی اداس ہیں
تاریکیوں کے زیبِ تن اجلے لباس ہیں

بھول جانا حادثوں کو بھیڑ کا دستور ہے
ایک پل میں بات سب آئی گئی سی ہوگئی

یہی بخشش ہے اس تہذیبِ نو کی
بشر اپنے ہی گھر میں اجنبی ہے

کوئی منزل نہیں راہِ طلب میں
یہاں ہر موڑ پر منزل نئی ہے

سچ کا کوئی بھی خریدار نہیں
جھوٹ نے ایسی تجارت کی ہے

''ایک جزیرہ دھوپ کا'' ساحل صاحب کے کلام کا تیسرا مجموعہ ہے، اس سے پہلے ان کے دو مجموعے اور چھپے ہیں جو دیوناگری لپی میں ہیں۔ اردو کے کسی مجموعے کا صرف ناگری لپی میں چھپنا ایک غور طلب مسئلہ ہے لیکن اس سے قطع نظر تین مجموعوں کے مصنف کی کہنہ مشقی متقاضی ہے کہ اس کا کلام زبان و بیان کی غلطیوں سے مبرّا ہو۔ ساحل صاحب کے کلام کے بارے میں یہ بات نہیں کہی جاسکتی۔ مجموعے کی پہلی ہی غزل کے مطلعے کا مصرعِ اول موزونیت کے اعتبار سے محلِ نظر ہے:

شکوہ ہی کیا جو عمر بھر راحت ملی نہیں

'بھر' کا حرفِ آخر 'ر' وزن سے خارج ہے۔ اگلی غزل کے مقطع کا مصرع ثانی ہے:

ہم ہیں ساحل، گردشِ دوراں ہمیں سمجھا ہے کیا

صحتِ بیان 'گردشِ دوراں' کے بعد 'نے' کی متقاضی ہے۔ کچھ اور مقامات بھی ہیں جو ساحل صاحب کی نظرِ ثانی کے محتاج ہیں۔

جو لوگ شاعری میں تازہ کاری کے قائل ہیں، اس مجموعے کا مطالعہ ان کے ذوق کی تسکین کا باعث ہوگا۔

•

یمبرزل / ترنم ریاض

صفحات: 186، قیمت: -/250 روپے

ناشر: نرالی دنیا پبلی کیشنز، A-368، بازار دلی گیٹ، دریا گنج، دہلی 2

مبصر: محمد رحمت اللہ اشرف

زیرِ تبصرہ افسانوی مجموعے کے ایک افسانے کا نام بھی ''یمبرزل'' ہے اس لحاظ سے روایتی طور پر اس مجموعے کا نام ''یمبرزل'' رکھا گیا ہے۔ یمبرزل (Yimbirzal) ایک پھول کا نام ہے جسے ہم اردو میں ''نرگس'' کے نام سے جانتے ہیں۔ اردو شاعری میں اس پھول کی توضیح کئی جہتوں سے کی گئی ہے۔ یہ پھول محبت میں مست و بیخود ہونے یا اپنے محبوب کی راہ میں سراپا انتظار ہونے کا استعارہ ہے۔

''یمبرزل'' میں کل 17 افسانے ہیں۔ ان افسانوں میں موسم، ماحول اور موضوع کی ہم آہنگی قارئین کو متاثر کرتی ہے۔ جذبے اور احساسات کی گرمی شروع سے آخر تک قائم ہے۔ بیشتر افسانے اردو کے معیاری ادبی رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ تمام افسانوں میں کوئی نہ کوئی چونکا دینے والا پہلو ضرور ہے جس کے سبب قاری دیر تک اور دور تک جو فکر ہو جاتا ہے۔ ان میں ''میرا کے شام'' تجربہ گاہ، ہم تو ڈوبے ہیں صنم، مجسمہ، یمبرزل اور شہر، ایسے افسانے ہیں جو اردو کے اچھے افسانوں میں جگہ پانے کے مستحق ہیں۔

ترنم ریاض بالکل بات چیت کرنے کے انداز میں افسانے لکھتی ہیں۔ افسانے کی ابتدا اس طرح کرتی ہیں کہ قاری ہمہ تن گوش ہو جاتا ہے، درمیان کا ماحول خوابوں کی ایک لامتناہی دنیا بساتا ہے اور افسانے کے انجام پر قاری چونک اٹھتا ہے۔ ترنم ریاض کے افسانے کہنے کے انداز پر پروفیسر زماں آزردہ نے بڑی پتے کی بات کہی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ترنم کی ایک خاص خصوصیت یہ ہے کہ یہ جیسے سوچتی ہیں ویسے ہی بولتی ہیں اور جیسے بولتی ہیں ویسے ہی لکھتی ہیں۔ یہ خصوصیت ہر مصنف میں نہیں پائی جاتی۔ اصل میں اس خصوصیت کی بنیاد خلوص اور خلوص پر اعتماد ہونے پر ہے۔''

(اسی مجموعے سے ''مشاہیر کے سوچ رنگ'' ص-179)

افسانے کی جزئیات اور اپنے بیان کو استعاراتی رنگ دینے میں ترنم ریاض تاریخ کا طویل سفر طے کرتی ہیں مگر بات اتنی سادہ اور سلجھے ہوئے انداز میں کہتی ہیں کہ قاری کو مواخذات کی دنیا میں ذرا بھی گھٹن نہیں ہوتی۔ افسانے کی جزئیات میں چڑیوں اور پھولوں کے مطالعے و مشاہدے سے دلکش استعاراتی رنگ بھرنے میں بھی ان کی فنی مہارت کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ انھوں نے ''یمبرزل'' میں جن موضوعات کو زیرِ بحث رکھا ہے ان میں وادیٔ کشمیر کے دلکش مناظر میں الھڑ دوشیزاؤں کی محبت اور گلشن، اپنا بچپن، ماضی کی یادیں، عورت کی مظلومی، مرد کی سفاکانہ محبت، تاریخی مقامات و عجائبات کے مٹتے نقوش، ماڈرن زمانے میں ٹین ایج (Teen-age) کی محبت کے نئے نئے انداز، بے خانگی، شہری بھیڑ

میں تنہائی، اولاد کی بے راہ روی شامل ہیں۔ وادیٔ کشمیر میں زندانوں میں قید زندگی اور انسانیت کی تلاش میں کراہتی روحوں کو مصنفہ نے قریب سے دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ اس ماحول میں ابھرنے والی حق و باطل کی شبیہ بڑے متوازن انداز میں اجاگر کی ہے۔ ''میرا کے شام'' عہدِ نو کے ایک نوخیز جوڑے کی محبت اور الھڑپن، والدین کی نگرانی میں پروان چڑھنے والی انوکھی کہانی ہے۔ اس کہانی میں محبت کے ساتھ عقل کی کارفرمائی بھی نظر ہے۔

سائنس اور ٹیکنالوجی کے ذریعے نت نئے نئے تجربات و انکشافات سے آج دنیا حیرت زدہ ہے۔ ان تجربات کے پیشِ نظر ترنم ریاض نے اپنے شعور کی رو کے ذریعے تاریخ کے عمل کو حقیقت کا رنگ روپ دے کر دیکھنے کی کوشش کی ہے کہ آیا اگر ایسا ممکن ہوا تو پھر اس دنیا کا رنگ روپ کیسا ہوگا؟ تجربے اور عمل کیسے ہوں گے؟ یہ ایسے افسانے ہیں جن کے مطالعے سے موصوفہ کی سائنس اور ٹیکنالوجی، طبیعی، کیمیاوی اور حیاتیاتی عمل و ردِ عمل سے گہری واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

وادیٔ کشمیر کے اہم مقامات کی قدیم تاریخ اور جغرافیہ سے بھی انھیں خاص دلچسپی ہے۔ مجسمہ، بالکنی، یمبرزل اور کشتی، ایسے افسانے ہیں جن میں تاریخی مجسمات، باقیات، عجائبات اور قدرتی دلکش مناظر کے اندر افسانے کے تانے بانے بنے گئے ہیں۔ آرٹ، تصویر اور ان کی تراش خراش کی باریکیوں سے بھی افسانے کے فنی لوازمات کو آراستہ کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

''یمبرزل'' ترنم ریاض کا تیسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ اس سے قبل ''یہ تنگ زمین'' اور ''ابابیلیں لوٹ آئیں گی'' دو مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ فکشن میں افسانے اور ناول کے علاوہ شاعری میں غزل، نظم اور ماہیے کی تخلیق میں بھی ان کی خاصی دلچسپی ہے۔ یہ بڑی خوش آئند بات ہے کہ ان کے فن کے پرستاروں کا حلقہ دن بہ دن وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ ان کے فن کا ارتقائی سفر جاری ہے اور یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ''یمبرزل'' پذیرائی کی سمت میں ترنم کی تمنا کا تیسرا قدم ثابت ہوگا۔

□□□

تحریکِ خلافت

مصنف: قاضی محمد عدیل عباسی

ہندستان میں چلائی جانے والی تحریکِ خلافت نے بالواسطہ طور پر ہماری تحریکِ آزادی کو بھی ایک نئی قوت عطا کی تھی۔ اس کتاب میں مصنف نے جو اس تحریک میں شریک تھے، تحریکِ خلافت کے تمام پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

دوسرا ایڈیشن، ڈیمائی، 219 صفحات، قیمت 65.00 روپے

تالستائے

مصنف: ڈاکٹر محمد یٰسین

تالستائے کی تصانیف ہمیں خواب و خیال کی دنیا سے حقیقت کی طرف لے جاتی ہیں۔ اس کے یہاں حیات و کائنات کا عرفان بھی ہے اور عام انسانی جذبات و احساسات کی عکاسی بھی۔ اس کتاب میں تالستائے کے سوانحی گوشوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کے فنی کارناموں پر بھی۔

دوسرا ایڈیشن، ڈیمائی، 152 صفحات، قیمت 46.00 روپے

بابرنامہ

تلخیص کار اور مترجم: ڈاکٹر محمد قاسم صدیقی

''تزکِ بابری'' کی تلخیص اور آسان اردو میں ترجمہ۔ یہ تلخیص ان حصوں پر مشتمل ہے جن میں بابر نے بہ طورِ خاص ہندستان کے رسم و رواج، یہاں کے موسموں، یہاں کی آب و ہوا یہاں کے پھلوں اور پھولوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب بچوں کے لیے خصوصی دلچسپی کی حامل ہے۔

دوسرا ایڈیشن، ڈیمائی، 101 صفحات، قیمت 15.00 روپے

برنارڈ شا

مصنف: عبدالمغنی

جارج برنارڈ شا ایک روشن خیال اور انسان دوست ادیب اور مفکر تھا جو نسل یا قومیت کی حد بندیوں سے نکل کر پورے عالمِ انسانیت کی بہتری کا خواہاں تھا۔ اس کتاب میں برنارڈ شا کے شخصی اور ادبی اوصاف تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔

دوسرا ایڈیشن، ڈیمائی، 96 صفحات، قیمت 35.00 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسبِ ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

بچوں کا گوشہ

مصنف: اگیلا گری راج کمار
مترجم: محمد آصف جاہ

زندگی کو سمجھنے اور اسے بہتر بنانے میں اچھا ادب معاون ہوتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے پڑھنے والوں کو یہ ذہنی تفریح بھی بہم پہنچاتا ہے۔ بڑوں کی طرح بچوں کا بھی یہ حق ہے کہ ان کی ذہنی ضرورتوں کے مطابق انہیں اچھا ادب فراہم کیا جائے جو سبق آموز ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہو تاکہ بچے خوشی خوشی اس کا مطالعہ کریں۔ قومی اردو کونسل نے بچوں کے لیے بڑی تعداد میں ایسی کتابیں شائع کی ہیں جو اس معیار پر پوری اترتی ہیں۔ ذیل میں کونسل کی شائع کردہ کتاب "22 مختصر کہانیاں" سے اقتباس پیش کیا جارہا ہے۔اس کتاب میں بچوں کے لیے بے حد دلچسپ کہانیاں پیش کی گئی ہیں جو ان کی معلومات میں اضافہ بھی کرتی ہیں۔148 صفحات کی اس کتاب کی قیمت 55 روپے ہے۔ کونسل اپنی کتابوں پر طلبہ اور اساتذہ کو 40فیصد کی خصوصی رعایت دیتی ہے۔

جڑواں شکل

گھر میں مکمل خاموشی تھی، البتہ کبھی کبھار سسکنے کی آواز ابھر جاتی تھی۔ رنجن کی اُس کے پاپا نے پٹائی کی تھی کیوں کہ سہ ماہی امتحان کی رپورٹ آچکی تھی، جس میں صاف صاف لکھا تھا کہ "آگے پروموشن مشکوک ہے۔"

پاپا اپنے کمرے میں پریشانی کے عالم میں تھے، رنجن زمین پر پڑا تھا۔ وہ رو رہا تھا جب کہ اُس کا سر ممی کی گود میں تھا۔ لیکن روی بہت بھوکا تھا۔ کھانے کا بھی اور اپنی تعریف کا بھی۔ اُس نے اپنی رپورٹ کی طرف فخر سے دیکھا، جس پر لکھا تھا "بہت عمدہ کام شاباش، ایسے ہی آگے بڑھتے رہو۔"

وہ اپنی کلاس میں فرسٹ آیا تھا۔ لیکن کسی نے بھی اُس کی پرواہ نہیں کی۔ انھوں نے تو صرف یہ دیکھا کہ رنجن تین مضمون میں فیل تھا۔

روی نے فیصلہ کیا کہ وہ اُن کو اپنی طرف راغب کرے گا۔ وہ اپنے پاپا کے پاس گیا اور بولا۔ "پپا، میری رپورٹ دیکھیے۔"

اُس کے پاپا نے رپورٹ کو غور سے دیکھا، اُس کے کندھے کو تھپ تھپایا اور کہا، "ویری گڈ" بس اتنا ہی؟ روی کو بڑا تعجب ہوا۔

اس پر پاپا بولے "اپنی رپورٹ، اپنے بے وقوف بھائی کو ذرا دکھاؤ۔"

"کیا آپ کو مجھ پر فخر نہیں ہے!" لیکن اُسے اپنے والدین کی صلاحیت پر اطمینان تھوڑا کم ہی تھا کہ وہ اس کے احساسات کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ وہ خاموش ہوگیا۔ وہ اپنے والدین کی طرف سے تعریفی الفاظ کو سننے کے لیے بے قرار تھا۔ لیکن ایسا ہو نہ سکا۔

وہ اپنی ممی کے پاس گیا "اماں، مجھے بھوک لگی ہے۔"

انھوں نے اُس کی طرف دیکھے بغیر سختی سے کہا۔ "کیا تم دیکھ نہیں سکتے، ہر چیز میز پر لگی ہے؟ جو تمھارا جی چاہے کھالو" وہ چڑ کر بولیں۔

اُس کا دل ٹوٹ گیا، اُس نے کھانے کا جائزہ لیا، آلو، بہت اچھے تلے ہوئے تھے، جس طرح کہ رنجن پسند کرتا تھا۔ انڈے، رنجن کی پسند کے مطابق ابلے ہوئے تھے۔ روی کو انڈے آلو کا سالن بہت پسند تھا۔ اماں، ان دنوں میری پسند کا کھانا کیوں نہیں بناتیں؟ یہاں ہر چیز رنجن کی پسند کے مطابق ہی کیوں ہوتی ہے؟ حالاں کہ اُس کے لائق نہیں ہے۔

روی غصے سے بپھر گیا۔ اُس نے پلیٹ سے سارے آلو لے لیے اور چاہتے نہ چاہتے ہوئے بھی سب کے سب کھا گیا۔ اُس کے بعد اُسے انتظار تھا کہ دیکھو اب کیا ہوتا ہے؟

اماں بمشکل رنجن کو میز پر لے آئیں۔ انھوں نے آلو کی پلیٹ کو خالی دیکھا وہ روی پر چڑھ دوڑیں۔ "کیا تمھارے پاس تھوڑی سی بھی عقل ہے؟ اب رنجن کیا کھائے گا۔"

اُس کے بھائی کا نام اُس کے اعصاب پر چھا گیا تھا! اُس نے پلٹ کر غصے سے جواب دیا۔ جو کچھ ہے اُسے وہ ہی کھانے دیجیے، اُسے بھوکا ہی مرنے دیں۔ وہ شاید تبھی سمجھے گا کہ فیل ہونے کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔

اُس کی ممی غصے سے بھڑک پڑیں! "رنجن کو سزا دینے کے لیے مجھے تمھاری مدد کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ بے حد ناراضگی سے بولیں "پپا نے اُس کی اچھی پٹائی کی ہے اور تم چاہتے ہو کہ وہ بھوکا بھی رہے۔ آخر وہ کیا کرے؟ وہ آگ بگولہ ہو رہی تھیں۔ وہ تیزی سے آلو خریدنے کے لیے گھر سے نکل گئیں۔

روی نے رنجن کی طرف دیکھا۔ بے وقوف، کمزور انسان، جب میں

پڑھتا ہوں یہ کھیلنے کے لیے نکل جاتا ہے اور اماں اس کے پیچھے پیچھے خوشامد کرتی دوڑتی ہیں کہ وہ تھک جائے گا۔ بیٹا دودھ پیو، پھلوں کا رس پیو، اُسے سب کچھ یاد آ رہا تھا اگر میں کبھی کسی چھوٹی سی چیز کی بھی فرمائش کر دوں تو وہ کہتیں، کیا یہ کام تم خود نہیں کر سکتے؟ تم دونوں کے پیچھے میں کس طرح دوڑتی رہوں۔" وہ یہ کیوں بھول جاتی ہیں کہ وہ میری بھی تو ماں ہیں۔ وہ مجھے رنجن کی خاطر نظر انداز کرتی ہیں۔ اُسی کی وجہ سے میرے لیے دشواریاں ہیں۔ میں اُس سے نفرت کرتا ہوں۔

روی کی اپنے ماں باپ سے ناراضگی بڑھتی ہی گئی اور وہ ششماہی امتحان میں اپنی صلاحیت کو برقرار نہیں رکھ پایا۔ کلاس میں اُس کی دسویں پوزیشن ہونے کی وجہ سے اُس کے ٹیچر اُس سے ناخوش تھے۔ لیکن روی دل ہی دل میں خوش تھا۔ اب ابا اور اماں، اُس کی بھی خوشامد کریں گے کہ بیٹا پڑھ لو۔ تھوڑا اُسے ڈر بھی تھا کہ ابا اُس کی پٹائی بھی کر سکتے ہیں۔ کوئی بات نہیں اماں اُس کے لیے اُس کی پسند کا کھانا بنائیں گی اور کھانے کے لیے خوشامد کریں گی۔

اُس نے اپنا رپورٹ کارڈ گھر میں لا کر دیا اور پہلے ہی اگلے مزیدار لمحوں کا انتظار کرنے لگا۔ لیکن افسوس۔ گھر میں کوئی طوفان نہ برپا ہوا۔ ماں باپ نے معمولی طور پر اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ "اب جب کہ ہم خوش تھے کہ رنجن اس مرتبہ تمام مضامین میں پاس ہو گیا تھا، تم نے ہمیں یہ رپورٹ لا کر دی ہے۔" کیا ہم کبھی بھی تم دونوں سے خوش نہیں ہو سکتے؟"

پھر وہی رنجن! روی نے غصے سے اپنے دانت بھینچ لیے۔ "آج بھی میرے رنجن کے مقابلے میں کہیں اچھے نمبر ہیں۔

وہ رنجیدہ ہو گیا۔

"مقابلہ کرنا بند کرو" اُس کے پاپا چلّائے۔

روی اب غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ اُس نے مختلف طریقوں سے اپنے والدین کی توجہ حاصل کرنا چاہی۔ اُس نے آخر کار فیصلہ کر لیا۔ میں بھی رنجن کی طرح فیل ہو جاؤں گا۔ اور پھر دوسری مرتبہ پاس ہو جاؤں گا۔ تب یہ لوگ مجھے بھی پیار کریں گے اور میری تعریف بھی کریں گے۔

روی کو اپنے اس فیصلے پر چلنے میں بہت دشواری ہوئی۔ وہ پڑھنے کا شوقین تھا وہ کلاس میں چاہتے ہوئے بھی لاپرواہ نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اپنا ہوم ورک کیے بغیر کبھی بھی اسکول نہیں جاتا تھا۔

لیکن وہ اپنے ماں باپ کا پیار پانے کے لیے تڑپ رہا تھا جیسا کہ وہ رنجن پر نچھاور کیا کرتے تھے۔ اور اُس کو حاصل کرنے کا تنہا راستہ فیل ہو جانا تھا۔ کیا وہ ایسا کر سکتا تھا؟ وہ اندر ہی اندر اس مشکل سے دوچار تھا۔ روی کی حالت دن بہ دن خراب ہونے لگی۔

اُس کے ماں باپ کو یہ یقین تھا کہ روی اپنے بارے میں بخوبی سوچ سکتا ہے اور اس لیے انھیں کمزور بچے، رنجن کی طرف زیادہ توجہ دینا چاہیے۔ وہ رنجن کو کامیاب بنانے میں اس قدر کھو چکے تھے کہ وہ یہ بھول ہی گئے کہ روی اُن کی توجہ حاصل کرنے کے لیے کس قدر بے قرار ہے۔

مِڈٹرم ٹیسٹ شروع ہو چکے تھے۔ روی نے اپنی خواہش کے برخلاف بھی پڑھنا جاری رکھا۔ کیوں کہ وہ ابھی بھی فیل ہونا چاہتا تھا۔

اُس نے میتھمیٹکس کے پیپر پر نظر ڈالی، وہ سب کچھ جانتا تھا۔ اُس کے اندر ایک عجیب قسم کی کشمکش شروع ہو گئی تھی۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اپنا ایک بھی سوال غلط حل کر دے؟ لیکن اگر وہ سب کچھ صحیح کر دیتا ہے تو اس کے والدین اُس کا تو وجود ہی شاید بھول جائیں گے۔

اُس کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں، وہ شرمسار تھا۔ اُس نے اپنے آنسوؤں کو پونچھ ڈالا اُس کے ہونٹوں سے ایک آہ نکل گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے اوپر قابو پاتا وہ بے حال ہو کر رونے لگا۔

اُس کے میتھمیٹکس کے ٹیچر اُس کے پاس آئے، وہ جاننا چاہتے تھے کہ کیا معاملہ ہے؟" تم ٹھیک تو ہو۔"

روی بُری طرح رو رہا تھا۔ وہ جواب بھی نہ دے سکا۔ وہ بہت عرصے سے اپنے دُکھ کو تنہا برداشت کر رہا تھا۔

کلاس کے تمام بچے، اپنے ٹیچر کے سب سے چہیتے شاگرد کو روتا دیکھ رہے تھے جو لکھنے کے بجائے روتا ہی جا رہا تھا۔

ٹیچر نے بلکتے ہوئے بچے کو ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس بھیج دیا۔

ہیڈ ماسٹر نے سب سے پہلے روی کو پانی دیا۔ جب روی خاموش ہوا تو انھوں نے پوچھا، کیا تم اس لیے رو رہے تھے کیوں کہ تم سوالات کے جوابات نہیں جانتے؟

روی نے ہلکے سے جواب دیا" میں ہر چیز جانتا ہوں، لیکن میں جواب دینا نہیں چاہتا۔"" جواب نہیں دینا چاہتا؟

کیوں؟"

روی خاموش تھا، وہ کس طرح اپنی پریشانی بتائے اور اگر وہ بتا بھی دے تو کیا ہیڈ ماسٹر صاحب اُس کی مشکل سمجھ سکیں گے؟"

میتھ میٹکس کے ٹیچر نے ہیڈ ماسٹر صاحب سے اُس کی بے حد تعریف کی۔

ہیڈ ماسٹر صاحب کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا، انھوں نے روی کے پاپا کو اپنے دفتر میں بلالیا۔

یہ سوچ کر کہ ضرور مسئلہ رنجن کا ہی ہوگا، اپا فوراً وقت ضائع کیے بنا پہنچ گئے۔ جب انھوں نے روی کو ہیڈ ماسٹر صاحب کے کمرے میں دیکھا تو انھیں اپنی آنکھوں پر یقین بھی نہیں آیا۔

روی! تم نے کیا کیا؟

روی کی آواز جذبات سے رندھ گئی۔ اُس نے اپنا سر دوسری طرف پھیرلیا۔

ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا'' آپ کے بیٹے نے اچانک کلاس میں بجائے ٹیسٹ دینے کے بے تحاشا رونا شروع کردیا۔ کیا آپ جانتے ہیں اس کو کیا تکلیف ہے۔''

اپا بالکل ششدر کھڑے تھے۔ جناب یہ تو بہت اچھا بچہ ہے۔ یہ تو بغیر کہے پڑھتا ہے۔ ہمیں اُس کی طرف سے کبھی پریشانی نہیں ہوئی۔

اچانک روی پھٹ پڑا'' میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے لیے بھی پریشان ہوں۔ جب کبھی بھی رنجن فیل ہوا، اُس کو اور زیادہ پیار کیا گیا۔ میں نے سوچا، اگر میں فیل ہوگیا تو آپ مجھے بھی پیار کریں گے۔ ورنہ آپ کو میری ذرہ برابر بھی پرواہ نہیں ہوگی۔ آپ مجھے پیار نہیں کرتے، آپ مجھے نہیں چاہتے۔ یہی وجہ تھی کہ میں فیل ہونا چاہتا تھا۔ لیکن میں فیل کیسے ہوسکتا تھا؟ مجھے تو ہر چیز آتی ہے!''

اپا خوفزدہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

ہیڈ ماسٹر صاحب نے اپا کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اتنی چھوٹی عمر میں اس بچے کے دماغ پر اس قدر بوجھ، واقعی بہت تکلیف دہ ہے۔ ہر بچہ اپنی جگہ اپنی اہمیت رکھتا ہے۔ آپ نے اس بچے کو ایسا کیوں محسوس ہونے دیا کہ آپ دوسرے بچے کو زیادہ چاہتے ہیں؟

اپا کو جواب دینے میں تھوڑی دیر لگی۔ پھر وہ بمشکل بولے'' سر روی اور رنجن جڑواں ہیں۔ پیدائش ہی سے رنجن کمزور رہا ہے۔ آج بھی وہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ چھوٹا ہے۔ اس میں برداشت کی طاقت بالکل نہیں ہے۔ اُسے بہت جلدی ہر قسم کی بیماری لگ جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ہم لوگ اُس پر زیادہ دھیان دینے لگے۔ اور اسی وجہ سے ہم اُس سے زیادہ لاڈ کرنے لگے اور روی کو بھول گئے کہ اُس کے ساتھ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ہم اکثر سوچتے کہ وہ روی جیسا کیوں نہ بنا، مجھے غصہ آجاتا اور میں اُس کی پٹائی بھی کردیتا۔''

''یہ تو بہت بُری بات ہے'' ہیڈ ماسٹر صاحب درست لہجے میں بولے۔

''اب ایسا کبھی نہیں ہوگا، واقعی ایسا کبھی نہیں ہونا چاہیے۔'' اپا نے وعدہ کیا۔

جس وقت بڑے لوگ یہ باتیں کر رہے تھے، روی کو چھ ماہ پہلا واقعہ یاد آرہا تھا جب رنجن بیمار پڑ گیا تھا۔ اُس کے ماں باپ رات دن اُس کے بستر کے پاس رہے اور انھوں نے باہر گھومنے جانے کا ارادہ بھی ترک کردیا۔ اُسی وقت سے روی میں رنجن کے خلاف نفرت کا جذبہ ابھرا تھا۔ وہ غصے سے بھر گیا تھا۔ جڑواں تو ایک روح دو قالب سمجھے جاتے ہیں، لیکن رنجن تو اس کے برعکس تھا۔ اُس نے اُس کے ماں باپ کو، اُن کے پیار کو اُس سے دور کردیا تھا۔ وہ کبھی بھی میرا دوست نہیں ہوسکتا۔

پرانی باتیں یاد کرتے ہوئے، روی کو اپنی نفرت پر بھی افسوس ہونے لگا۔ اماں اور اپا، رنجن کو اس لیے زیادہ توجہ دیتے تھے کہ وہ بھی میری ہی طرح ہوسکے اُس نے سوچا۔ آخر میں نے اس بات کو کیوں نہیں سمجھا؟ مجھے رنجن کا اچھا دوست ہوجانا چاہیے تھا۔ جب وہ بیمار تھا، میں اُس کا دل بہلا سکتا تھا۔ اُس نے اپنی زندگی کو بغیر رنجن کے تصور کیا، اُس کے چہرے پر مایوسی کے کالے سائے چھا گئے۔

وہ تکلیف سے چیخ پڑا۔'' نہیں ایسا نہیں ہوسکتا''

اُس کے پاپا اور ہیڈ ماسٹر صاحب نے اُس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

'' اپا، روی جھجکتے ہوئے بولا، مجھے بے حد افسوس ہے، میں اتنا خودغرض کیسے ہوگیا۔ آج سے رنجن کی دیکھ بھال میں، میں آپ کی مدد کروں گا۔ اُس کے پاپا کا چہرہ خوشی اور اطمینان سے کھل اُٹھا۔ کیوں کہ وہ بحران جس نے پورے گھر کی خوشی اور امن کو داؤ پر لگا دیا تھا، بغیر کسی نقصان کے گذر گیا۔

روی ہیڈ ماسٹر صاحب کی طرف مڑا اور کہا'' سر اگلے سال سے کیا آپ مہربانی فرما کر ہم دونوں کو ایک ہی کلاس میں رکھ سکیں گے؟ اس طرح میں پڑھائی میں رنجن کی مدد کرسکوں گا۔

ہیڈ ماسٹر صاحب نے اثبات میں سر ہلایا لیکن ساتھ میں تنبیہ بھی کی کہ وہ اپنی پڑھائی سے ہرگز غافل نہ ہو۔ یہ بہت ضروری ہے۔ میں تمھارا آج کا امتحان کسی اور دن لے لوں گا۔

ہیڈ ماسٹر صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے، پاپا اور اُن کا بیٹا اطمینان سے باہر نکل گئے۔

ہیڈ ماسٹر صاحب اُن کے اطمینان کو دیکھ کر مسکرائے۔

□□□

مولانا محمد علی جوہر اکادمی کی طرف سے مولانا محمد علی جوہر کے 128 ویں یوم ولادت پر تقسیم ایوارڈ کا جلسہ غالب اکادمی بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی میں منعقد ہوا۔
اس موقعے پر عالی جناب بی.ایل. جوشی لیفٹیننٹ گورنر، دہلی نے مختلف شخصیات کو مولانا محمد علی جوہر ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ تصویر میں (دائیں سے) جناب رحمٰن نیر (مدیر "بیسویں صدی" نئی دہلی)
جناب سید شاہد مہدی (سابق وائس چانسلر، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی)، جناب ہنس راج بھاردواج (مرکزی وزیر قانون)، بیگم عصمت مرزا، جناب بی.ایل. جوشی، جناب شہریار اور جناب جگدیش اگروال۔

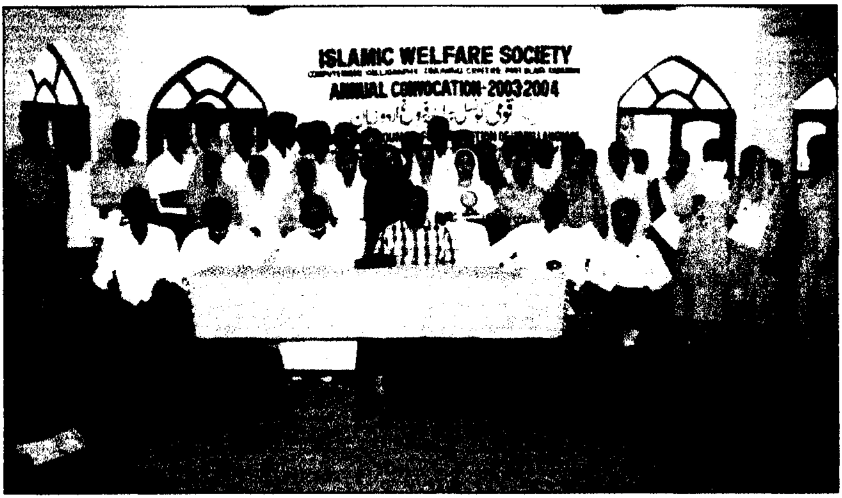

قومی اردو کونسل کی طرف سے اسلامک ویلفیئر سوسائٹی، پورٹ بلیئر میں چلائے جا رہے کمپیوٹر سینٹر کے تیسرے بیچ کا جلسہ تقسیم اسناد 8 دسمبر 2004 کو
جناب ایم.ایس. ملک کمار سکریٹری انڈمان نکوبار اسٹیٹ سوشل ویلفیئر کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس موقعے پر لی گئی ایک یادگار تصویر۔

URDU DUNIYA Monthly, February 2005, Vol. 7, Issue: 2
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Secondary & Higher Education, Ministry of H.R.D., Government of India, New Delhi

جناب ارجن سنگھ

ڈیرڈاکٹر رفیق زکریا

اردو ریویو کمیٹی کے چیئرمین کے طور پر آج صبح آپ نے مجھے جو رپورٹ دی، اس کے لیے میں آپ کا شکرگزار ہوں۔ ہم لوگ رپورٹ کا توجہ سے مطالعہ کرکے آپ کی تجویز کردہ نکات کا جائزہ لیں گے تاکہ اس پر مناسب کارروائی کی جاسکے۔

اس رپورٹ کی تیاری میں آپ کی خدمات کے لیے وزارت ترقی انسانی وسائل کی طرف سے میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ قومی تعلیمی پالیسی سے متعلق امور میں آپ ہماری مدد کرتے رہیں گے۔

نیک خواہشات کے ساتھ۔

ارجن سنگھ
مرکزی وزیر برائے ترقی انسانی وسائل،
حکومت ہند

ڈاکٹر رفیق زکریا

قومی اردو کونسل نے مرکز میں متحدہ ترقی پسند محاذ حکومت کے قیام کے بعد ملک میں اردو کی صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے ممتاز دانشور اور رہنما ڈاکٹر رفیق زکریا کی صدارت میں ایک ریویو کمیٹی تشکیل دی تھی۔ اس کمیٹی کے دو دیگر ممبران جموں وکشمیر کے سابق چیف سکریٹری جناب موسیٰ رضا اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر جناب سید شاہد مہدی تھے۔ ریویو کمیٹی کی رپورٹ 18 دسمبر 2004 کو ڈاکٹر رفیق زکریا نے جناب ارجن سنگھ کو پیش کی۔ اس رپورٹ میں ملک کے اردو میڈیم اسکولوں کے معیار میں بہتری لانے، مادری زبان میں بنیادی تعلیم فراہم کرنے، اردو کو مناسب مقام دلانے اور قومی اردو کونسل کو مزید اختیارات دینے کی سفارش کی گئی ہے۔

Printed and Published by Director, NCPUL on behalf of NCPUL, Printed at J.K. Offset Printers, Jama Masjid, Delhi-110006 and Published at NCPUL, West Block-I, Wing-6, R.K. Puram, New Delhi-110 066, Editor Dr. M. Hamidullah Bhat. Tel : 26103381, 26103938